ہندوستانی معیشت

(نویں اور دسویں درجوں کے لیے نصابی کتاب)

مصنفین

برج کشور
لکچرار، شری رام کالج آف کامرس، دہلی

ایس۔ کے بھٹناگر
لکچرار، اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، نئی دہلی

ترقی اردو بورڈ ، نئی دہلی

ہندوستانی معیشت

(نویں اور دسویں درجوں کے لیے نصابی کتاب)

مصنفین

برج کشور

لکچرار، شری رام کالج آف کامرس، دہلی

ایس۔ کے بھٹناگر

لکچرار، اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، نئی دہلی

ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

پہلا اردو ایڈیشن 1000 .... 1977 1899 شک

انگریزی: سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن
اردو۔ ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود، نئی دہلی

INDIAN ECONOMY

قیمت: 5.30 روپے

مترجم: یامین پرویز

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر بیورو فار پروموشن آف اردو، ویسٹ بلاک 8 آر، کے، پورم
نئی دہلی 110022 نے، نودیپ پرنٹرز، غازی آباد، سے چھپوا کر ترقی اردو بورڈ نئی دہلی
کے لیے شائع کیا۔

پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقی اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بہت سی نصابی کتابیں، بچوں کے ادب، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی و ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلیکیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومتِ ہند

فہرست

پیش لفظ

منجملہ دوسرے کاموں کے سنٹرل بورڈ آف ایجوکیشن اپنے ممبر اسکولوں کے لیے مناسب نصاب تعلیم مرتب کرکے ثانوی تعلیم کو مزید بہتر بنانے کی مسلسل کوشش کرتا رہا ہے۔ جیسا کہ آپ واقف ہیں بورڈ کے تعلیمی نظام میں ایک اہم تبدیلی کی گئی ہے۔ اور اسکول کی تعلیم کے طریقے میں 10+2 کے طریقے کو اپنایا گیا ہے۔ اس انقلابی تبدیلی کے مطابق، نصاب تعلیم کو از سر نو سنوارا گیا ہے۔ جدید اور عقلی بنا کر بہتر بنایا گیا ہے تاکہ سیکھنے اور سکھانے کے کام کو مزید مفید بنایا جا سکے۔

تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے دوسرا اہم اور ضروری قدم مناسب درسی کتب کی فراہمی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نئی اسکیم کے تحت بورڈ نے کتابیں تیار کرنے اور شائع کرنے کا ایک جامع پروگرام تیار کیا ہے۔ اُمید ہے یہ کتابیں نہ صرف موجودہ نصاب تعلیم کے عین مطابق ہوں گی بلکہ اُن سے اس پروگرام کو تقویت بھی ملے گی۔

موجودہ درسی کتاب اس سمت میں ایک چھوٹا مگر اہم قدم ہے۔ نو یں

اور دسویں کلاسوں کی ضرورتوں کے پیشِ نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اُمید ہے یہ ان کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

یہ بورڈ، دہلی اسکول آف اکونومکس (دہلی یونیورسٹی) کے پروفیسر کے۔ لے نقوی اور اسکول آف کورس پونڈنس کورسز اینڈ کونٹی نوئنگ ایجوکیشن (دہلی یونیورسٹی) کے جناب اے۔ ایس۔ والش کا شکرگذار ہے، جنھوں نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی نظرثانی کی اور بورڈ کے سکریٹری ڈاکٹر آر۔ پی۔ سنگل اور ڈپٹی سکریٹری جناب ایچ۔ آر۔ شرما کا بھی شکرگذار ہے جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر جی، ایل بخشی

چیرمین

سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن

نئی دہلی

تعارف

اس کتاب کی تصنیف میں بورڈ کے پیش کردہ نصاب تعلیم کو مدنظر رکھا گیا ہے تاکہ طلبا کو ہندوستانی معیشت کے بنیادی مسائل اور ان کے حل کے لیے کیے گئے اقدامات سے واقف کرایا جا سکے اور ان کو معاشیات کی بنیادی اصطلاحات اور نظریات سے حقیقی زندگی کے سیاق و سباق میں روشناس کرایا جا سکے۔ جب طلبا ہندوستانی معیشت اور اس کی نشوونما و ترقی میں حائل اور اثرانداز ہونے والی قوتوں کا مطالعہ کریں گے تو ان کا اپنا ایک طرز فکر بنے گا۔ اور اس طرح وہ اپنے کو سماج کی بھلائی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکیں گے۔ کیونکہ کتاب کا تعلق نئے سیکھنے والوں سے ہے اس لیے زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان رکھا گیا ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد طلبا کے سوچنے کے طریقہ کو اجاگر کرنا ہے اور بنیادی علم سے واقف کرانا ہے۔

ہندوستانی معیشت کے مسائل اور ان سے متعلق اعداد و شمار دونوں ہی پیچیدہ اور الجھے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے حل کیا جا سکے۔ اور کوئی بھی معلومات ایسی نہیں ہے جسے قابلِ اعتبار سمجھا جا سکے۔ اس لیے جہاں کہیں بھی کوئی مسئلہ آیا ہے، ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ اسے مختصراً بیان کیا جائے بہت غور و فکر کے بعد معلومات کی روشنی میں منتخب دلیلوں کو ہی لیا گیا ہے۔

نصابِ تعلیم کی چھ اکائیوں کو چودہ ابواب میں اس طرح پھیلایا گیا ہے کہ تمام مواد ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ پہلے باب میں طلبا کو ہندوستانی معیشت پر ماضی کے اثرات سے واقف کرایا گیا ہے اور برصغیر ہند پر برطانوی استحصال سے آگاہ کرایا گیا ہے۔ اگلے دو ابواب میں ماضی کی غربت اور پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ترقی پر زور دیا گیا ہے اور ایک فہرست دی گئی ہے جس میں اس مقصد کے لیے موجودہ یا مستقبل میں حاصل ہونے والے وسائل کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں دوسری جنگ عظیم اور تقسیم سے ہونے والے معاشی نقصانات کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصّے کے دو ابواب میں منصوبہ بندی کے مقاصد اور پنج سالہ منصوبہ بندی کی کامیابیوں اور رکاوٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس سے آگے کے دو بابوں میں زر کے رول، ہمارا مالیاتی اور سودی نظام اس کی خصوصیات اور طریقہ کار کو بیان کیا گیا ہے۔

چند اہم اور پریشان کن مسائل جیسے غریبی، بے روزگاری، آبادی، خوراک زراعتی پسماندگی اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر اگلے پانچ ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ آخری باب میں ہندوستان کے ان معاشی امکانات کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو سماج وادی نظام قایم کرنے کی ہماری جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب نوجوانوں کو ہندوستان کے معاشی مسائل پر زیادہ سے زیادہ خیال آرائی کرنے کی ترغیب دے گی۔ ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ یہ بحث و مباحثہ ترقی کے لیے قومی جدوجہد میں مدد دے گا۔

ہمیں پوری امید ہے کہ یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں طلبا کی ضرورتوں کو پورا کر سکے گی۔ ہم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ حقیقی تعلیم کے لیے طلبا کو مناسب حالات و واقعات اور اعداد و شمار سے واقف کرانا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں ہمیں مختلف حلقوں سے مدد ملی ہے۔ اس میں روحانی مدد سے لے کر عملی مدد جیسے ٹائپنگ اور مسودہ کی طباعت تک شامل ہے۔ ہم سنٹرل بورڈ کے چیرمین ڈاکٹر جی۔ ایل بخشی اور سکریٹری ڈاکٹر آر۔ پی۔ سنگھل کے احسان مند ہیں کہ جنھوں نے ہمیں یہ درسی کتاب لکھنے کا موقع دیا۔ ڈاکٹر وی۔ سی۔ گپتا نے اس کتاب کے مسودہ کو دیکھا ہم ان کے قیمتی مشوروں کے لیے بھی شکر گذار ہیں۔
سنٹرل بورڈ کے ڈپٹی سکریٹری جناب ایچ۔ آر۔ شرما نے مسودہ کی تیاری اور اس کی تکمیل میں جو کوششیں کی ہیں اس کے لیے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں۔ یہ ہماری فرض ناشناسی ہوگی اگر سلیبس تیار کرنے والی کمیٹی کا شکریہ ادا نہ کریں اور خاص طور سے جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر مونس رضا کا جنھوں نے اس کتاب کا بنیادی خاکہ تیار کیا۔ آخر میں ہم ان تمام اساتذہ اور دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں نہ صرف ہماری مدد کی بلکہ ہمت افزائی بھی کی۔

دہلی
۹ رمئی ۱۹۷۵ء

مصنفین

دوسرا ایڈیشن

موجودہ ایڈیشن پر نظر ثانی کر کے اس کو آج کے حالات کے مطابق ڈھالا گیا ہے۔ حکومت نے عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے حال ہی میں جو اقدامات کیے ہیں وہ سب اس ایڈیشن میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا باب

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

تعارف

سن عیسوی کے آغاز سے قبل بھی ہندوستان ایک ترقی یافتہ تمدن اور پختہ معیشت کا حامل تھا گپت عہد (چوتھی صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک) میں ہندوستان شان وشوکت کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھا۔ اس دور کو بجا طور پر سنہری دور کہتے ہیں۔ یہ دور چودھویں صدی عیسوی تک جاری رہا اور اس کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا۔

سن عیسوی کے پہلے ہزار سال کے دوران ہندوستان بڑے پیمانے پر یورپی ملکوں سے تجارت کرتا تھا۔ کالی مرچ اور گرم مسالے برآمد کیے جاتے تھے۔ ہمارا ملک سوتی کپڑے کی صنعت میں سب سے آگے تھا۔ اس کی غیر ملکی بازاروں میں بڑی مانگ تھی۔ ریشمی کپڑا بھی بنایا جاتا تھا۔ اس صنعت میں اس کا شمار چین کے بعد ہوتا تھا۔ ہمیں بہت سے سمندری فوائد حاصل تھے۔ چونکہ سمندر ہمارے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ہم مشرقی جزیروں سے مختلف جگہوں پر مال لے جا سکتے تھے۔ اور تجارتی مال لے جانے والوں کی طرح خوب نفع کما سکتے تھے۔

ہماری جہاز سازی کی صنعت کافی ترقی یافتہ تھی اور ہم نے جنگ میں کام آنے والی

بہت سی مشینوں کو ترقی دی تھی۔ دواسازی اور دھات سازی میں بھی ہماری حالت کافی اچھی تھی۔ ہم فولاد بنانا جانتے تھے اور ہمارا لوہا اور فولاد دنیا کی اقتصادی منڈیوں میں بہت قیمتی اور اعلیٰ معیار کا سمجھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ایک اور اہم قدم رنگ سازی کی ترقی کے لیے اُٹھایا گیا جس کی بنیاد نیل تھا۔ نیل کی دریافت نے ہمارے کپڑے کی صنعت اور غیر ملکی تجارت کو مزید ترقی دی۔

یہ دستکاریاں شہروں میں پھیلیں۔ شہروں میں یا تو انتظامیہ کے مرکز ہوتے یا عدالتیں ہوتیں یا یہ راجدھانیاں ہوتیں یا پھر مقدس مقامات ہوتے تھے۔ بہت سے شہر اہم تجارتی راستوں جیسے بڑے دریاؤں کے کناروں یا اہم سڑکوں پر آباد تھے۔ شہروں کی زندگی دیہاتوں کی زندگی سے مختلف تھی۔ شہروں میں بہت سی دستکاریاں اور مختلف قسم کی تجارتیں پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف دیہات شہروں سے الگ تھلگ تھے اور کم و بیش اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں خود کفیل تھے۔ وہ اپنی آبادی کی ضروریات کے لیے پیداوار کرتے تھے۔ اور باہر کی دنیا سے چیزوں کا تبادلہ بہت کم کرتے تھے۔ گاؤں میں مزدوروں کی سماجی تقسیم تھی۔ کسان کھیتی باڑی کرتے تھے اور اناج اُگاتے تھے۔ جولاہا کپڑے تیار کرتا تھا۔ بڑھئی کسان کے لیے اوزار بناتا تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ تھے جیسے کمہار، نائی، سنار، موچی، لوہار وغیرہ سب اپنے اپنے کام گاؤں والوں کے لیے کرتے تھے۔ اور گاؤں کی پیداوار میں اپنا روایتی حصہ حاصل کرتے تھے۔ گاؤں اپنی ضروریات کی تمام تر چیزیں تیار کر لیتے تھے اور صرف چند ہی چیزوں کے لیے باہر کی دنیا پر انحصار کرتے تھے۔ گاؤں میں اقتصادی خود کفالت اور مزدوروں کی سماجی تقسیم دیہی علاقوں میں سماجی تنظیموں کی اہم خصوصیات تھیں۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

ہندوستان نے 1947 میں آزادی حاصل کی۔ اس سے پہلے تقریباً دوسو سال تک ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے رہے۔ جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک چارٹر کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کیے تھے۔ اس کمپنی کو برصغیر ہند کی تجارت کی اجارہ داری دی گئی جو 1833 تک جاری رہی۔ بعد میں کمپنی نے سیاسی طاقت حاصل کی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے بنیاد فراہم کی۔

سترھویں صدی کے آغاز میں مغل شہنشاہوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس شہر کی بنیاد رکھی۔ 1662 میں بمبئی کے جزیرے کو انگلینڈ کے چارلس دوم نے کمپنی کو دے دیا۔ جسے چارلس دوم نے پرتگال سے جہیز میں حاصل کیا تھا۔ 1690 میں کلکتہ شہر کی بنیاد پڑی۔ سترھویں صدی کے آخر تک انگریز اپنے قدم جمانے کے لیے محض چند جگہیں حاصل کر سکے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ جلد ہی انگریز ہندوستان میں ایک طاقتور حکومت قائم کر لیں گے۔ کیونکہ انگریزوں کے لیے تجارت بھی زیادہ منافع بخش نہیں تھی 1757 میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے ان کے قبضے میں پہلی مرتبہ ایک بہت بڑا علاقہ آگیا اور اس کے بعد چند سالوں میں بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے قبضے میں آ گئے۔ بس یہیں سے انگریزوں کی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ 1818 میں مرہٹوں کی شکست اور 1849 میں سکھوں کی شکست کے بعد پورا ملک برطانوی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

انگریزوں کی آمد کے وقت ہندوستان کی معاشی حالت

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے وقت ہمارا طریقہ پیداوار، صنعتی و تجارتی ادارے دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے تھے۔ ہم ایک بہت ترقی یافتہ صنعت کار قوم تھے۔ ہماری برآمدی تجارت یورپ اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا بنک کاری کا نظام بھی ترقی یافتہ تھا۔ ہمارے کاروباری اور مالی اداروں کی ہنڈیاں وسطی ایشیا کے زیادہ تر ملکوں اور ہندوستان میں ہر جگہ تسلیم کی جاتی تھیں۔ مال فروخت کرنے کے انتظامات بھی معقول تھے۔ آڑھتیے، ٹھیکے دار، دلال جیسے بیچ کے لوگوں کا طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ جہاز سازی کی صنعت اطمینان بخش طریقے سے ترقی کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک ہندستانی فرم نے برطانوی امیرالبحر کے لیے ایک فلیگ شپ تیار کیا تھا جسے نپولین کے ساتھ جنگوں میں استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستانی کاریگروں کی دست کاری اتنی اچھی تھی کہ ہمارے صنعت کار اپنی چیزوں کو مغربی ملکوں کی منڈیوں میں وہاں کی بنی اعلیٰ صنعتی چیزوں کے مقابلے میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی مال برطانیہ کی منڈیوں میں چھایا ہوا تھا۔ حالانکہ وہاں مشینوں کا استعمال ہونے لگا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی صنعت کاروں کو بد دل کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بعض چیزوں کی درآمد پر مکمل پابندی عاید کر دی اور کچھ پر بھاری ٹیکس لگا دیے گئے۔ تاکہ ہندوستانی صنعتی مال کو باہر جانے سے روکا جا سکے۔ ہمارے پورے ملک میں بڑی تعداد میں صنعتی و تجارتی مرکز موجود تھے۔ 1757 میں بنگال کے شہر مرشد آباد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہاں جائدادوں کے مالکوں کی تعداد لندن شہر کے جائدادوں کے مالکوں کی تعداد سے زیادہ

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

ہندوستان نے 1947 میں آزادی حاصل کی۔ اس سے پہلے تقریباً دو سو سال تک ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے رہے۔ جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک چارٹر کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کیے تھے۔ اس کمپنی کو برصغیر ہند کی تجارت کی اجارہ داری دی گئی جو 1833 تک جاری رہی۔ بعد میں کمپنی نے سیاسی طاقت حاصل کی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے بنیاد فراہم کی۔

سترھویں صدی کے آغاز میں مغل شہنشاہوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس شہر کی بنیاد رکھی۔ 1662 میں بمبئی کے جزیرے کو انگلینڈ کے چارلس دوم نے کمپنی کو دے دیا۔ جسے چارلس دوم نے پرتگال سے جہیز میں حاصل کیا تھا۔ 1690 میں کلکتہ شہر کی بنیاد پڑی۔ سترھویں صدی کے آخر تک انگریز اپنے قدم جمانے کے لیے محض چند جگہیں حاصل کر سکے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ جلد ہی انگریز ہندوستان میں ایک طاقتور حکومت قائم کریں گے۔ کیونکہ انگریزوں کے لیے تجارت بھی زیادہ منافع بخش نہیں تھی 1757 میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے ان کے قبضے میں پہلی مرتبہ ایک بہت بڑا علاقہ آگیا اور اس کے بعد چند سالوں میں بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے قبضے میں آ گئے۔ بس یہیں سے انگریزوں کی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ 1818 میں مرہٹوں کی شکست اور 1849 میں سکھوں کی شکست کے بعد پورا ملک برطانوی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

انگریزوں کی آمد کے وقت ہندوستان کی معاشی حالت

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے وقت ہمارا طریقہ پیداوار، صنعتی و تجارتی ادارے دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے تھے۔ ہم ایک بہت ترقی یافتہ صنعت کار قوم تھے۔ ہماری برآمدی تجارت یورپ اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا بنک کاری کا نظام بھی ترقی یافتہ تھا۔ ہمارے کاروباری اور مالی اداروں کی ہنڈیاں وسطی ایشیا کے زیادہ تر ملکوں اور ہندوستان میں ہر جگہ تسلیم کی جاتی تھیں۔ مال فروخت کرنے کے انتظامات بھی معقول تھے۔ آڑھتیے، ٹھیکے دار، دلال جیسے بیچ کے لوگوں کا طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ جہاز سازی کی صنعت اطمینان بخش طریقے سے ترقی کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک ہندستانی فرم نے برطانوی امیرالبحر کے لیے ایک فلیگ شپ تیار کیا تھا جسے نپولین کے ساتھ جنگوں میں استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستانی کاریگروں کی دست کاری اتنی اچھی تھی کہ ہمارے صنعت کار اپنی چیزوں کو مغربی ملکوں کی منڈیوں میں وہاں کی بنی اعلیٰ صنعتی چیزوں کے مقابلے میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی مال برطانیہ کی منڈیوں میں چھایا ہوا تھا۔ حالانکہ وہاں مشینوں کا استعمال ہونے لگا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی صنعت کاروں کو بددل کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بعض چیزوں کی درآمد پر مکمل پابندی عاید کر دی اور کچھ پر بھاری ٹیکس لگا دیے گئے۔ تاکہ ہندوستانی صنعتی مال کو باہر جانے سے روکا جا سکے۔ ہمارے پورے ملک میں بڑی تعداد میں صنعتی و تجارتی مرکز موجود تھے۔ 1757 میں بنگال کے شہر مرشد آباد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہاں جائدادوں کے مالکوں کی تعداد لندن شہر کے جائدادوں کے مالکوں کی تعداد سے زیادہ

تھی۔ مشرقی بنگال میں ڈھاکہ اپنی ململ کے لیے پوری دنیا میں مشہور تھا۔
اس زمانے میں ہندوستانی معیشت کافی ترقی یافتہ اور منظم تھی۔ بہرحال برطانوی اقتصادی پالیسی کی وجہ سے ہماری معیشت اس درجے تک قایم نہیں رہ سکی۔

ہندوستان میں برطانوی مفادات اور حکمت عملی

پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ انگریز ہندوستان میں منظم تاجروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ 1757ء میں پلاسی کی جنگ کی کامیابی نے ان کو ملک کے کچھ علاقوں پر قابض بنادیا تھا۔ حقیقت میں برطانیہ کی اپنی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ مشینوں کا سب سے پہلا اثر صنعت کاروں پر پڑا۔ پھر کان کنی کے کاموں پر اور آخر میں ذرائع آمدورفت اور رسل و رسائل متاثر ہوئے۔

اس زمانہ کی سب سے اہم ایجاد بھاپ کی قوت تھی جو حرکت دینے والی قوت کا سب سے زیادہ طاقتور ذریعہ تھا۔ لیکن بھاپ کی دریافت نے دو نئی چیزوں کی طلب پیدا کی۔ ایک کوئلے اور دوسری لوہے کی۔ پہلی سے گرمی حاصل کی گئی اور دھاتوں کو پگھلایا گیا۔ دوسری سے مشینیں بنائی گئیں۔ اور بھاپ سے حرکت میں آنے والے آلات تیار کیے گئے۔ جو بھاپ کی گرمی اور دباؤ کو برداشت کرسکیں۔ لیکن بھاری خام لوہے کی کانوں تک بغیر کسی بار برداری کے ذرائع کے نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ اس نئی ضرورت کے تحت ریل گاڑیوں کو ترقی دی گئی۔ اور بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بھی تیزی سے بنائے گئے۔ بڑی تعداد میں انجینیرنگ کے کارخانے کھلے، جہاں مشینوں کے لیے کل پرزے اور آلات بننے لگے۔ کیمیائی صنعتوں نے بھی بہت

تیزی سے ترقی کی۔ اس کی اہم وجہ پہلے سے موجود سوتی کپڑے کی صنعت کو کپڑا رنگنے کے لیے کیمیائی رنگوں کی سخت ضرورت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کا آغاز سوتی کپڑے کی صنعت سے ہی ہوا تھا۔ 1764 میں کپڑا بننے کی مشین 'اسپننگ جے نی' ('spinning jenny') ہارگریوز آف بلیک برن (Hargreaves of Blackburn) نے ایجاد کی۔ اس مشین سے ایک ہی وقت میں آٹھ کتائی کرنے والے آدمیوں کا کام کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد 1769 میں آرک رائٹ (Arkwright) نے 'واٹر فریم' ('Waterframe') نامی مشین اور 1779 میں کرامپٹن میول ('Crompton's mute') نامی مشین ایجاد کی۔ 1785 میں پاور لوم ( ) ایجاد ہوا جس کے موجد ایڈمنڈ کارٹ رائٹ (Edmud Cartwright) نام کے ایک پادری تھے۔

1765ء میں جیمس واٹ (James Watt) کی بھاپ کے انجن کی ایجاد ایک شاندار کامیابی تھی جیمس واٹ گلاسگو میں آلات بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس ایجاد کو 1769 میں پیٹنٹ کرالیا گیا اور اس سے سوتی کپڑے کی صنعت کو ایک نیا موڑ ملا۔

صنعتی انقلاب نے انگلستان کی معیشت کا ڈھانچہ ہی بدل دیا۔ اس انقلاب کے ساتھ انجینیرنگ، لوہے کے کام، بھاپ سے چلنے والی مشین، صنعتی کیمیا (رنگ اتارنے، رنگ چڑھانے اور چھپائی کے کام) کوئلہ کی کان کنی، ذرائع آمدورفت نے بھی بہت تیزی سے ترقی کی۔ ان تمام چیزوں نے مل کر برطانوی معیشت کی پیداواری صلاحیت کو خوب بڑھادیا۔ اس بڑھی ہوئی پیداوار کو اسی مقام پر قائم رکھنا اور اس کو مزید بڑھانا تب ہی ممکن تھا جب اس پیداوار کو بیچنے کے لیے نئی منڈیاں مل جائیں۔ اگرچہ مشینیں ایجاد ہوچکی تھیں اور طریقہ پیداوار قایم ہوچکا تھا۔ مگر سرمایہ کی ہمیشہ کمی رہتی تھی برطانیہ میں صنعتوں کو پھیلانے کے لیے بہت بڑی تعداد میں سرمایہ

کی ضرورت تھی۔ جو ملک کے اندرونی یا گھریلو ذریعوں سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔
اس لیے سرمایہ حاصل کرنا اور اپنا مال فروخت کرنے کے لیے منڈیاں تلاش کرنا
انگریزوں کے اہم مفادات بن گئے۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی صنعتی اشیا جن کی شہرت نہ صرف
برطانیہ بلکہ یورپ میں تھی ان کو ختم کر کے ہی برطانوی صنعتی اشیا کے لیے راستہ صاف
کیا جا سکتا تھا۔

برطانوی صنعتی نظام کو بہت بڑے تجارتی پھیلاؤ کی ضرورت تھی۔ نئی منڈیاں
تلاش کرنا اور ان کو حاصل کرنا ہی اب اُس کا مقصد تھا۔ حکومت برطانیہ کے تحت جو
علاقے تھے وہاں سب سے پہلے اسی پروگرام پر عمل کیا گیا۔ ہندوستان بہت بڑا
ملک ہونے اور معاشی طور سے مالا مال ہونے کی وجہ سے یہاں بہت آسانی سے یہ مقصد
حاصل ہو گیا۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی پارلیمنٹ نے انتہائی خود غرضانہ
تجارتی پالیسیوں کو اپنایا اور اٹھارھویں صدی کے بڑے بڑے تاجروں کو نکال باہر
کیا۔ انھوں نے ہندوستانی اشیا سے لوگوں کو بددل کر دیا تاکہ ان کا اپنا مال زیادہ
فروخت ہو اور ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے والا ملک بنا دینے کا راستہ اختیار
کیا۔ اس طرح ہندوستان کا خام مال انگلینڈ کے کارخانوں اور صنعتوں کے لیے
جانے لگا اور وہاں سے تیار مال یہاں آنے لگا۔ ذرائع آمدورفت اور باربرداری کے
بہتر ذریعوں کی بدولت یہ ممکن ہو سکا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے اور ریشمی کپڑے
پر انگلینڈ میں بھاری درآمدی ڈیوٹی لگا دی گئی۔ جب کہ برطانوی چیزیں ہندوستان
میں ٹیکس کے بغیر ہی درآمد ہوتی رہیں۔ یا برائے نام درآمدی محصول لگایا جاتا تھا۔
بالکل اسی طرح جب بجلی سے چلنے والے کرگھے ہندوستان میں استعمال ہونے لگے
تو سوتی کپڑے پر ایکسائز ڈیوٹی لگا دی گئی، جس کی وجہ سے ہندوستانی کپڑا چین اور

جاپان کی منڈیوں میں، مقابلے میں نہیں ٹھہر سکا۔ کیونکہ اس کی قیمت دوسرے ملکوں کے کپڑے کی قیمت کے مقابلے میں بڑھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ بھاپ سے چلنے والے نئے ہندوستانی ملوں کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی تجارتی مفادات کو فروغ دیا جائے۔

خلاصہ

انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے صدیوں قبل، ہندوستانی معیشت اور تہذیب کافی ترقی یافتہ تھی۔ اگرچہ یہاں کی آبادی کا سب سے بڑا پیشہ زراعت تھا مگر پھر بھی ہندوستانی دستکاریوں کو غیر ملکی منڈیوں میں ان کی بہتر کوالٹی کی بدولت خوب شہرت حاصل تھی۔ خاص طور سے ہندوستان اپنے سوتی اور ریشمی کپڑے، فولاد، سنگ تراشی، سنگ مرمر کے کام، زیورات اور دھاتوں کے تار وغیرہ کے لیے کافی مشہور تھا۔ یہ دستکاریاں نہ صرف مقامی ضرورت کو پورا کرتی تھیں بلکہ مغربی یورپ کے ملکوں کی منڈیوں میں بھی خوب فروخت ہوتی تھیں۔

شروع میں مہم جو تاجر ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستان میں اسی مقصد کے لیے آئی تھی۔ وہ ہندوستانی اشیا (دستکاریاں، گرم مسالے) کو یورپ کے ملکوں میں برآمد کر کے جہاں ان کی بہت مانگ تھی خوب نفع کمانا چاہتی تھی۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں انگلستان میں صنعتی انقلاب آچکا تھا۔ اس کی وجہ سے طریقہ پیداوار میں زبردست تبدیلیاں ہوئیں۔ ان تبدیلیوں نے پیداوار میں اضافہ کیا۔ محنت کی تقسیم نے بڑی تعداد میں تیار شدہ مال کی

پیداواری لاگت کو گھٹا دیا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے تھے۔

1. برطانوی صنعتوں کی پیداواری وسعت میں زبردست اضافہ اور پیداواری لاگت میں زبردست کمی (خاص طور سے سوتی کپڑے کی صنعت میں)
2. اس ترقی کے نتیجہ میں برطانوی صنعتوں کا تیار سامان ہندوستانی دستکاریوں کے تیار مال کے مقابلے میں زیادہ سستا اور قدرے بہتر تھا۔
3. برطانوی صنعتوں کی غیر معمولی پیداواری قوت میں اضافے کی وجہ سے انگلینڈ کو ضرورت تھی (a) صنعتی مال کو فروخت کرنے کے لیے زیادہ منڈیوں کی (b) اپنی صنعتوں کے لیے خام مال کی فراہمی کی تاکہ یہاں کی صنعتیں چلتی رہیں اور یہاں کی آبادی کے لیے اشیائے خوردنی مہیا کی جا سکیں۔ چھوٹا ملک ہونے کی وجہ سے نہ تو یہاں مقامی منڈی اس قابل تھی کہ وہ اپنے ملک میں ہونے والی صنعتی پیداوار کو کھپا سکے اور نہ خام مال اور خوراک کے معاملہ میں یہ ملک خود کفیل تھا۔

صنعتی انقلاب سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی دستکاریوں کو یورپ کے ملکوں میں فروخت کر کے خوب نفع کماتی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد صورت حال اس کے برعکس ہو گئی۔ اب برطانوی تیار شدہ مال ہندوستانی منڈیوں میں فروخت ہونے لگا۔ اور ہندوستان کا سستا خام مال برطانوی صنعتوں کے لیے خریدا جانے لگا۔ اور برطانوی آبادی کے لیے یہاں سے اشیائے خوردنی جانے لگیں۔ صنعتی انقلاب نے انگلستان میں معاشی قوتوں اور ہندوستانی غیر ملکی تجارت کے طریقہ کو بدل دیا۔ ہندوستانی معیشت سے متعلق ان تبدیلیوں کے اثرات کے بارے میں اگلے باب میں بتایا جائے گا۔

دوسرا باب

ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثرات

تعارف

پچھلے باب میں بھارت کے شاندار ماضی کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے ہندوستانی معیشت دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھی۔ ہمارے صنعت کار منظم تھے اور ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑا، دھاتوں سے بنی ہوئی چیزیں اور دوسری مصنوعات اتنی اچھی ہوتی تھیں کہ اکثر غیر ملکی ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستان میں آئی۔ اور اس نے ہندوستان کی مصنوعات سے خوب تجارتی نفع کمایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انتظام برطانوی تاج کے حوالے کر دیا۔ اور اس کے بدلے بہت بڑی رقم معاوضہ میں حاصل کی۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ کا مقصد تجارت میں اضافہ اور سامراجی استحصال تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے برطانوی باشندوں کی دلچسپی ہندوستان کی قدرتی معدنی دولت سے بڑھ گئی تھی۔ اس انقلاب نے برطانوی باشندوں کو برصغیر ہند میں اپنے ملک کے لیے لوٹ کھسوٹ کرنے کی ترغیب دی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت تقریباً دو سو سال تک رہی جس کے نتیجہ میں ہندوستان کو

بہت سی محرومیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس باب کا مقصد ان برے نتائج پر روشنی ڈالنا ہے جو انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے پیدا ہوتے۔

1۔ ملکی صنعتوں کا زوال

پچھلے باب میں یہ اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان دنیا میں اٹھارویں صدی تک اہم صنعتی ملک تھا۔ برطانیہ کی تجارتی پالیسی کی وجہ سے اس میں رکاوٹ آئی۔ خودغرضانہ برطانوی تجارتی پالیسی نے ہماری دیسی صنعتوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہندوستانی صنعتوں اور دستکاریوں کا زوال کئی اقدامات کی وجہ سے ہوا۔

(i) ہندوستانی مصنوعات پر برطانوی بازاروں میں غیر معمولی پابندیاں لگائی گئیں۔ بھاری درآمدی ٹیکس لگا کر ایسا کیا گیا۔ یہ ٹیکس 1823ء میں 67 فیصد تھا۔ اس کی وجہ سے برطانیہ کی منڈیوں میں ہندوستان کو سوتی اور ریشمی کپڑے کی کم قیمت ہونے کا جو نفع حاصل تھا وہ ایک دم ختم ہوگیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ محصول لگنے سے پہلے ہندوستانی کپڑے برطانوی کپڑوں کے مقابلہ میں 50 سے لے کر 60 فیصدی تک کم قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ اس کے باوجود نفع حاصل ہوتا تھا۔ اگر یہ محصول نہ لگایا جاتا تو پیسلے (Paisley) اور مانچسٹر (Manchester) کے کارخانے کھلتے ہی بند ہو جاتے اور بھاپ کی قوت بھی ان کے وجود کو قائم نہ رکھ سکتی۔

(ii) ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ہندوستانی دست کار اپنی دست کاری جاری نہیں رکھ سکے۔ سرکاری احکامات کے تحت انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارخانوں میں

کام کرنے اوران کواپنے نجی کرگھے بند کردینے کے لیے مجبور کیا گیا۔ مثال کے طور پر بنگال میں کچے ریشم کی پیداوار کی اجازت تودے دی گئی مگر ریشم کے کیڑے پالنے اوردھاگے تیار کرنے پرپابندی لگادی گئی۔ اوران کاموں میں لگے ہوئے لوگوں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوتی اورریشمی کپڑے کی پیداوار گھٹ گئی جسے ہم یورپ اورایشیا کے بازاروں میں برآمد کرتے تھے اب وہ درآمد ہونے لگا۔

اس طرح صرف بنگال پریذیڈنسی میں 23-1822 میں کپڑے کی درآمد 14-1813, کے مقابلے میں سات گنا بڑھ گئی تھی۔ جبکہ اس عرصے میں برآمد کی تعداد اس علاقے سے 46 لاکھ روپے سے گھٹ کر صرف 3 لاکھ روپے رہ گئی تھی۔ بنگال کے کتائی کرنے والے کاریگروں کوبھی نقصان اُٹھانا پڑا مگر کچھ عرصے کے بعد 26-1825. میں سوتی دھاگے کی درآمد صرف 81,000 روپے تھی مگر دوسرے سال یہ رقم بڑھ کر 8 لاکھ روپے ہوگئی اس طرح کاتنے اور بُننے والے کاریگروں کا کاروبار دھیرے دھیرے اُن سے چھوٹ گیا وہ یاتو برطانوی درآمد پر یا بھارت میں موجود برطانوی کارخانوں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے لگے۔

(iii) محصول سے آزاد برطانوی مصنوعات کے ہندوستان میں داخلہ نے اس صورت حال میں مزید اضافہ کیا۔ بعض حالتوں میں ان کو بہت معمولی اور برائے نام محصول ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح ہندوستانی بازاروں میں برطانوی مال ہندوستان میں بنے ہوئے مال کی قیمت کے مقابلے میں سستا بکنے لگا۔ ہندوستانی پیداکاروں، صنعت کاروں اوردست کاروں کی مصنوعات بنانے کی قوت مال کی قیمت نہ ملنے کی وجہ سے گھٹنے لگی۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ملکی کارخانے بند ہوگئے اورہندوستانی صنعت میں زوال آگیا۔

(iv) یہ سب توہوہی رہا تھا اس کے ساتھ برطانوی مشینوں نے برتری

حاصل کرکے باقی ماندہ ہندوستانی دستکاریوں کو بھی ختم کر دیا۔ مشینوں کے آگے کاریگر بے کار ہو گئے۔

(۷) اسی دوران، دست کاریوں اور ہتھ کرگھوں کو ہندوستانی راجاؤں اور نوابوں کی طرف سے جو امداد ملا کرتی تھی وہ بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ برطانوی حکومت کے نئے صاحب لوگ جو سرمایہ ہونے کی وجہ سے قوت خرید رکھتے تھے وہ برطانوی مصنوعات کو ترجیح دیتے تھے۔ آخر کار ہندوستانی صنعتیں اور دستکاریاں پہلے شہروں میں اور بعد میں دیہاتوں میں ختم ہو گئیں۔ ملک کی قدیم صنعتی اساس تو تباہ ہو گئی مگر افسوس کہ نئی صنعتیں بھی قائم نہیں ہو سکیں۔

زراعتی انحطاط

کیونکہ برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستانی خام مال کی پیداوار بڑھائیں تاکہ برطانوی کارخانے چلتے رہیں اس لیے انھوں نے ایسی پالیسی کو اپنایا جس سے تجارتی فصلوں جیسے جوٹ اور نیل کو فروغ حاصل ہو۔

1860ء کے بعد کپاس کی پیداوار کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ غذائی فصلوں کے مقابلہ میں تجارتی فصلوں کی طرف رجحان بڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ تجارتی فصلوں کی زیادہ قیمت ملتی تھی تجارتی کھیتی باڑی کو مقابلتاً زیادہ سرمایے کی ضرورت تھی، اس لیے کسان قرض دینے والے مہاجنوں پر زیادہ انحصار کرنے لگے۔ قحط کے زمانے میں یا جب تجارتی فصلوں کی طلب دنیا کی مارکیٹ میں کم ہوتی تو کسان دیوالیہ ہو جاتے اور ان کی زمین پر مہاجن قبضہ کر لیتے تھے۔ اس وجہ سے کسان زیادہ سے زیادہ غریب اور زمین سے بے دخل ہوتے گئے۔ قرض دینے والے ساہوکار قرض کے بدلے زمین حاصل کرتے سے بڑی بڑی زرعی زمینوں کے مالک بن کر زمیندار کہلانے لگے۔ صنعتی ترقی بہت معمولی

یا صفر کے برابر رہ گئی۔

ایک طرف صنعتی ترقی بہت معمولی یا صفر کے برابر تھی، دوسری طرف آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی، اس وجہ سے کسانوں میں غربت پھیلی اوران کی مصیبتوں میں اضافہ ہوا۔ کاریگر پہلے ہی بے روزگار ہو چکے تھے ان اسباب کی وجہ سے دیہاتوں میں غربت بڑھ گئی۔ زراعت کی ترقی رک گئی۔ کیونکہ کسان کے پاس کھیتی میں سرمایہ کاری کے واسطے فالتو رقم نہیں تھی۔ اس سے لگان وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس پر گورنمنٹ کے خرچوں کا بھی بوجھ تھا۔ لیکن زراعت کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، سینچائی اور زرعی زمین کی بھی حالت تقریباً ویسی ہی خراب تھی۔ آخری نتیجہ یہ نکلا کہ 1890 اور 1947 کے درمیان زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ جمود طاری رہا۔

قومی دولت کا اخراج

ہندوستان کو نہ صرف تیزی کے ساتھ غیر صنعتی ملک بنایا گیا بلکہ یہاں کی دولت کو خاصی مقدار میں باہر لے جایا گیا۔ شروع میں ہندوستانی محصول سے حاصل شدہ روپے سے ہندوستانی مصنوعات خریدی گئیں اور ان کو یورپ کی منڈیوں میں زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کیا گیا۔ منافع کی بچی رقم برطانیہ میں جمع ہو جاتی۔ اس سے برطانوی باشندوں میں "سونے کی خواہش" بڑھ گئی۔ اس لالچ میں انھوں نے برصغیر ہند میں لوٹ کھسوٹ کے نئے نئے طریقے نکالے۔ بنگال جو ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال علاقہ تھا اس پالیسی کا سب سے پہلے شکار ہوا۔ زراعت پر غیر منصفانہ ٹیکس لگایا گیا۔ اور اس کو بڑی بے دردی سے وصول کیا جانے لگا۔ 1793- 1882, کے درمیانی دور میں 90 فیصدی شرح کے حساب سے زمین ٹیکس لگایا گیا اور

شمالی ہندوستان میں ٹیکس 80 فیصدی شرح سے زیادہ تھا۔ بمبئی اور مدراس میں زمین ٹیکس کسانوں سے براہ راست وصول کیا جاتا تھا اور اس کی شرحوں میں ہر تیس برس کے بعد تبدیلی کردی جاتی تھی۔ جبکہ بنگال میں یہ مستقل طور پر طے کردیا گیا تھا۔ کسانوں کے پاس ٹیکس ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا وہ مشکل سے کھیتوں پر محنت اور مزدوری کے معاوضہ کے برابر بھی نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً تمام ٹیکسوں کی رقم انگلینڈ میں ہی جمع کردی جاتی تھی۔ دوسرا دولت کا اخراج وہ سود تھا جو ہندوستان کو پبلک ڈیٹ یا عوامی قرضوں پر ادا کرنا ہوتا تھا۔ پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے کہ حکومت برطانیہ نے جو قیمت ایسٹ انڈیا کمپنی کو دی تھی۔ اس معاوضہ کی یہ رقم ہندوستان پر قرض تسلیم کی گئی تھی جو ہندوستان کو ادا کرنی تھی۔ اس کی ادائیگی محصولوں سے حاصل ہوئے سرمائے سے کی گئی۔ ,1857 میں یہ قرض 5 کروڑ 10 لاکھ پونڈ تھا۔ جو بڑھ کر 1901 میں 20 کروڑ پونڈ ہوگیا۔

ہندوستان برطانیہ کو انتظام حکومت کے خرچ کے لیے ہوم چارجز کے نام پر بہت بڑی رقم ادا کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ رقم تقریباً 1 کروڑ 60 لاکھ پونڈ سالانہ تھی۔ ہندوستان میں انتظامی امور پر تعینات گورے افسران (ملازمتیں جن کی اجارہ داری تھی) کی تنخواہوں پر ایک کروڑ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ ہندوستان کی قومی آمدنی کا اس طرح آدھا حصہ ملک سے باہر چلا جاتا تھا۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دولت کے اس اخراج نے انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کو ممکن بنایا۔ اس کے بغیر برطانیہ میں سرمایہ کا قحط پڑ گیا ہوتا اور بھاپ کی طاقت کی چمک دمک ہوا میں اُڑ گئی ہوتی۔ جیسے جیسے بنگال کا خزانہ برطانیہ پہنچا بنک آف انگلینڈ نے دس پندرہ پونڈ کے نوٹ جاری کیے۔ اور صنعتی انقلاب کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قرضے دینے شروع کردیے۔ جہاں دولت کے اخراج نے برطانوی

کارخانے داروں، پیداکاروں اور صنعت کاروں کی قرض کی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد کی وہاں ہندوستان میں اس سے غریبی پھیلنے لگی۔

4. شہروں کی ترقی اور زوال

نئے کارخانے قائم ہونے کی وجہ سے پرانے شہروں اور تجارتی مراکز نے اپنی اہمیت کھودی۔ جو شہر دریاؤں اور سڑکوں کے ذرائع آمدورفت اور باربرداری کی وجہ سے زندہ تھے، وہ اس وقت گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ تجارتی راستے بدل گئے اور ریل گاڑیوں نے دریائی راستوں اور سڑکوں کی جگہ لے لی۔ مرزاپور، پٹنہ، ساگر وغیرہ ایسے ہی شہر ہیں۔ شہری دستکاریوں میں کمی آنے کی وجہ سے ڈھاکہ، مرشدآباد اور تنجور وغیرہ شہروں کی آبادی میں بھی کمی آئی اور ان کی پہلی سی ساکھ ختم ہوگئی۔ گیا اور بنارس جیسے مذہبی اہمیت کے مقدس شہروں نے بھی اپنی اہمیت کھودی کیونکہ ان جگہوں کی پرانی حرفتوں کی مصنوعات کی طلب کم ہوگئی۔ قدیم شہروں کی اہمیت وبائی بیماریوں کی وجہ سے بھی کم ہوگئی۔ لوگ محفوظ جگہوں پر چلے گئے اور اس طرح پرانے شہروں کی آبادی میں کمی آنے لگی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انگریزوں کے زمانے میں بہت سے نئے شہروں اور قصبوں کا فروغ ہوا۔ ریلوں اور بحری جہازوں نے بہت سے تجارتی مراکز کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ بمبئی، کراچی، مدراس، کلکتہ اور دہلی ایسے شہر ہیں جن کا فروغ انگریزوں کی بدولت ہوا۔ نئی صنعتوں کی ترقی نے صنعتی شہروں اور قصبوں کی آبادی میں اضافہ کیا۔ بمبئی، احمدآباد، شولاپور، دہلی، کانپور، جمشیدپور وغیرہ کے آس پاس بہت سے صنعتی مرکز بن جانے کی وجہ سے ان شہروں کو شہرت ملی۔ انتظامی مراکز نے بھی ایسے شہروں کی ترقی میں مدد دی جہاں انتظامیہ کے صدر دفتر تھے۔ صوبائی،

مرکزی اور ریاستی راجدھانیوں کے شہروں کی اہمیت دوسرے شہروں کے مقابلے میں بڑھ گئی۔ تعلیمی سہولیات زیادہ تر بڑے شہروں تک محدود ہونے کی وجہ سے وہاں کافی تعداد میں گاؤں اور قصبوں کے طلبا آنے لگے۔

شہروں میں آباد ہونے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ مثال کے طور پر شہری آبادی 1931 میں 37 کروڑ تھی۔ 1941 میں یہ بڑھ کر 50 کروڑ ہو گئی۔ گنجان آبادی والے شہر مدراس اور بمبئی میں آبادی بڑھنے کی شرح تیز ہو گئی۔ مدراس میں 1901 میں آبادی 287 کے نشان سے 1941 میں بڑھ کر 391 تک پہنچ گئی (یعنی 36.1 فیصدی اضافہ) اسی دوران بمبئی میں یہ 200 سے 272 ہو گئی (یعنی 36.0 فیصدی اضافہ ہوا)

یہ اعداد بھی ظاہر کرتے ہیں کہ دیہی علاقے سے لوگ شہری علاقے کی طرف کس رفتار سے آرہے تھے۔ زیادہ تر انگریزوں کے آخری دور میں خاص طور سے پہلی جنگ عظیم کے بعد صنعتی ترقی کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔

5۔ ریل گاڑیوں کا زمانہ

برطانوی تاجروں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے اندرونی حصے میں ان کے مال کی کھپت آسانی سے ہو سکتی ہے اگر ریلوں کا جال بچھا دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے سیاسی دباؤ سے بھی کام لیا۔ 1845 میں دو ریلوے کمپنیاں قائم ہوئیں۔ جن کے نام ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پنینسولار ریلوے کمپنی تھے۔ حکومت ہند نے ان کمپنیوں کو یہ یقین دلایا کہ انھیں ریلوں پر لگائے ہوئے سرمائے پر 5 فیصدی نفع ضرور ملے گا۔ اگر انھیں اس سے کم نفع ہو تو حکومت اپنے خزانے سے اسے پورا کرے گی۔ اس گارنٹی کا اثر یہ ہوا کہ ریلوے کمپنیوں نے روپیہ غیر ضروری طور پر خرچ کیا

دنیا میں ریلوے کی تاریخ میں اس طرح کی کوئی اور مثال نہیں ملتی 1873 تک ریلوے کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی بھاری خرچ ہوتے رہے۔ ملک کے ان علاقوں میں بھی ریلیں چلائی جانے لگیں۔ جہاں ان کی اس وقت ضرورت نہیں تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ علاقے ریلوے کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ 1901 میں 25,373 میل لمبی ریل کی پٹریاں 22 کروڑ 8 6 لاکھ پونڈ خرچ کرکے بچھائی گئیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں ریلوے کی ترقی کے لیے بہت خواہش مند تھی۔ چاہے اُس کی لاگت منافع سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت نے بار بار برطانیہ کی پرائیویٹ کمپنیوں کو ریلوں کی تعمیر میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ کمپنیوں کے سرمایہ پر کم سے کم سود دینے کا وعدہ بھی کیا۔ اور اُس تمام سرمایہ کی واپسی کی ضمانت بھی دی جو وہ لگا رہے تھے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ بھارت کے اندرونی علاقوں تک پہنچا جائے۔ تاکہ برطانوی پیدا کاروں اور صنعت کاروں کے لیے نئی منڈیاں مہیا ہوسکیں۔ لیکن یہ مقصد دریاؤں اور بحری راستوں سے بھی حاصل ہوسکتا تھا جو پہلے سے ہی موجود تھے۔ دراصل برطانوی باشندوں کو ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کا تو تجربہ تھا مگر وہ نہروں تعمیر کرنا نہیں جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ریلوں کی تعمیر سے اُن کا ایک ذاتی فائدہ بھی تھا۔ اور اس مفاد کے تحت وہ ریلوں کی تعمیر پر لگائے ہوئے سرمائے سے حاصل شدہ نفع کو اپنے انجینئرنگ اداروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوے کی ترقی پر بہت دھیان دیا گیا اور سرمایہ کاری کی گئی اس لیے ریلوے کی ترقی اُس وقت کی معیشت کی ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔

مجموعی نتائج

آگے آنے والی بحث سے واضح ہوجائے گا کہ برطانوی پالیسوں نے ہندوستانی

معیشت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اس ملک کی قدرتی دولت سے اپنے ملک کو خوشحال بنانے کی
نہ ختم ہونے والی خواہش کی وجہ سے برطانوی باشندوں نے ایسی پالیسی اپنائی جس سے
ہندوستانی مکمل طور سے ان کے غلام بنے رہیں۔ ہر اعتبار سے اس ملک کو برطانوی نوآبادی
بنا دیا گیا۔ اس پالیسی کو اپنانے کا مطلب ہندوستان کو ایک زرعی ملک ہی بنا رہنے دینا
تھا۔ جدید صنعتوں کی ترقی کی راہ میں آزادانہ طور پر مزاحمت کی گئی۔ صرف ایسی صنعتوں کو فروغ دینے
کی اجازت دی گئی جس سے برطانیہ کی ضرورتیں پوری ہوں جیسے کپڑا، جوٹ، شکر اور فولاد کی
صنعتیں۔ ان میں سے بہت سی صنعتوں کی طرف دوسری جنگ عظیم کے دوران خاص
طور سے توجہ دی گئی۔ کیونکہ برطانیہ جنگ میں شامل تھا۔ اور جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے
کے لیے ان صنعتوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس سے پہلے معاشی نظام یا ملکی معیشت کا ڈھانچہ
کچھ اس طرح تھا کہ ہم خام پٹ سن اُگاتے تھے لیکن پٹ سن کی مصنوعات۔ ڈنڈی
میں تیار ہوتی تھیں۔ ہم کپاس اُگاتے تھے لیکن سوتی کپڑا لنکا شائر میں تیار ہوتا تھا۔ ہم
چائے کے پودے لگاتے تھے اور اُن کی پتیاں چُنتے تھے۔ لیکن چائے ڈبوں میں بند
لندن میں ہوتی تھی۔ اور وہیں سے اُس کی برآمد ہوتی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران جہازوں
میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ صورت حال قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ساتھ ہی راستے میں
بمباری کا بھی خطرہ موجود تھا۔ چونکہ پٹ سن کے سامان اور سوتی کپڑوں کی جنگی
کاموں کے لیے زیادہ ضرورت تھی اور کچے پٹ سن کو بھارت سے ڈنڈی کے ملوں
اور کپاس کو لنکا شائر کے ملوں کے لیے جہازوں سے لے جانا اب بہت
مشکل ہوگیا تھا۔ اس لیے ان صنعتوں اور دوسری صنعتوں کو اب ہندوستان
میں ہی قائم کیا جانا بے حد ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی مشینی آلات،
بجلی کا سامان، صنعتی مشینیں، ریل کے انجن اور جہاز سازی جیسی صنعتوں کو
انگلینڈ میں رہنے دیا گیا۔ ہندوستان میں دراصل جو کچھ بھی صنعت کاری ہوئی اور

کارخانے لگائے گئے۔ وہ برطانوی حکومت کی اُس مجبوری کی وجہ سے ہوئی جس میں وہ پھنس گئی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں اپنے دورِ حکومت میں برطانیہ نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کارخانوں میں بنے ہوئے مال، مشینوں اور پیداوار کے جدید طریقوں کی ترقی کے لیے ہندوستان کو اپنا غلام بنائے رکھیں۔ اس طرح عوامی معیشت صرف زراعت تک محدود رہی۔ اس وجہ سے ملک کا معاشی ڈھانچہ یا معاشی نظام غیر متوازن ہوگیا۔

خلاصہ

پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ انگلینڈ میں صنعتی انقلاب نے کس طرح اپنی اقتصادی ضروریات میں اہم تبدیلیاں کیں۔ اب برطانیہ کو اپنی کثیر صنعتی پیداوار کو فروخت کرنے کے لیے بڑی بڑی منڈیوں کی ضرورت تھی اور متواتر خام مال کی رسد و غذائی اشیا کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہتی تھی تاکہ اس کی صنعتیں چلتی رہیں۔ اس باب میں (1) مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے برطانوی پالیسی اور (2) اس پالیسی کے ہندوستانی معیشت پر اثرات، کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی پالیسی

صنعتی انقلاب کے قیام لے بعد برطانوی سیاست کا مقصد ہندوستانی دستکاریوں کی ترقی کو روکنا اور انگریزی صنعتی پیداوار کی فروخت کو فروغ دینا تھا۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی زمانے میں جبکہ انگریزی سامان ہندوستان کی اعلیٰ مصنوعات کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ انگریزوں نے مندرجہ ذیل ہتھکنڈوں سے ہندوستانی دستکاریوں کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔

1. انگلینڈ میں ہندوستانی مال کی درآمد پر بھاری محصول لگایا۔
2. برطانوی سامان کی معمولی محصول پر یا محصول سے آزاد ہندوستان میں درآمد۔
3. بعض اشیا کی براہ راست تیاری کی صنعت کاروں کو ممانعت۔
4. جدید اور بحری راستوں کا جال بچھایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں اندرونی ملک میں نقل و حمل کا خرچ کم ہوگیا اور برطانوی سامان کی مقابلہ کی قوت ہندوستانی مصنوعات کے خلاف بڑھ گئی۔
5. اسی زمانے میں نہر سوئز کے کھلنے سے بحری جہازوں کے کرائے میں کافی کمی ہوئی۔ اس وجہ سے بھی برطانوی سامان کی مقابلہ کی قوت ہندوستان میں بڑھ گئی۔
6. برطانوی راج کی وجہ سے شہزادے، نواب، راجہ وغیرہ ختم ہونے لگے اور ان کی سرپرستی میں چلنے والی دستکاریاں بھی ان کے ساتھ ساتھ ختم ہونے لگیں۔ انگریزوں کا وفادار ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جس نے مغربی طور طریقے اور طرز زندگی اپنا کر ہندوستان میں نئی طلب پیدا کی۔

مندرجہ بالا برطانوی پالیسیوں نے نہ صرف ہندوستانی دستکاریوں کو مکمل طور سے ختم کر دیا بلکہ نئی صنعتیں بھی قایم نہیں ہوئیں۔ ان دستکاریوں میں لگے ہوئے لوگ خاص طور پر ہتھ کرگھوں میں کام کرنے والے جولاہے بے روزگار ہو گئے۔ شہروں میں ان کو کوئی اور کام بھی نہیں ملا۔ ان کو دیہاتوں میں زندگی گذارنے کے لیے واپس جانا پڑا۔ اس لیے برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ تھا ہندوستانی دست کاریوں کا زوال اور شہروں کے دستکاروں، جولاہوں اور کاریگروں کی "واپس زمین کی طرف چلو" تحریک۔

زراعت

انگریزوں نے اپنے معاشی مقاصد حاصل کرنے کے لیے (1) ایسی تجارتی فصلوں کی ہمت افزائی کی جن کی ضرورت ان کے کارخانوں کو تھی۔ اور (2) گاؤں میں زمین کی حق ملکیت کے نئے طریقے کا اطلاق کیا۔ ان پالیسیوں سے مندرجہ ذیل نتائج نکلے۔

1. حق ملکیت کے نئے طریقے نے گاؤں کی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔
2. زمینی ٹیکس اتنا زیادہ تھا کہ کسانوں کے پاس زمین پر مزید سرمایہ کاری کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا تھا۔
3. فصل کے برباد ہو جانے پر کسانوں کو مہاجنوں سے اونچی شرح سود پر قرض لینا پڑتا تھا۔ قرض کی ادائیگی نہ کر سکنے پر کسانوں کو اپنی زمین مہاجنوں کے ہاتھوں بیچ دینی پڑتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غیر حاضر زمیندار اور مہاجن جو خود کھیتی باڑی نہیں کرتے تھے اس نئے طریقۂ حق ملکیت کی وجہ سے زمین کے مالک بن گئے۔

اس زمانے میں مندرجہ بالا حالات کی وجہ سے جبکہ زمین غیر حاضر زمینداروں کے قبضے میں تھی آبادی کا دباؤ (جولاہوں اور دست کاروں کے شہروں سے بے روزگار ہونے کی وجہ سے) دیہاتوں میں بڑھ گیا۔ اس سے مندرجہ ذیل نتیجے نکلے۔

(a) زیر کاشت زمین کا رقبہ کاشت کار کے پاس کم ہو گیا۔ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے زمین کی مزید تقسیم ہوئی کم روزگاری بڑھی۔

(b) بے زمین کاشت کاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ چونکہ مہاجنوں سے

انھیں زمین سے بے دخل کر دیا تھا۔ اور شہروں سے اجڑے بے گھر دستکار اور کرائے دار دیہاتوں میں آگئے تھے۔

(c) کاشت کار اپنی غربت کی وجہ سے اپنی چھوٹی چھوٹی زمینوں پر سرمایہ کاری نہیں کر سکتے تھے اور غیر حاضر زمینداروں کو براہ راست کاشت کاری پر سرمایہ کاری کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس زمانے میں زیر کاشت زمین کے رقبے کاشت کاری کے طریقے اور سینچائی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

(d) ہندوستانی زراعت کی ترقی کے لیے حکومت نے بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

قومی دولت کا اخراج

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں انگریزی سرکاری افسروں اور غیر سرکاری انگریزوں نے اپنی بچتوں، تحفوں اور ہندوستان کی طرف سے جنگوں کے خرچوں کو پورا کرنے کے لیے کمپنی کو دی گئی رقم کی شکل میں بہت سارو پیہ انگلینڈ بھیجا کمپنی نے جب حکومت برطانیہ کو اقتدار منتقل کیا تو ہوم چارجز کے نام پر کافی سرمایہ انگلینڈ بھیجا گیا جس میں عوامی قرضوں پر سود کی رقم، ریلوے کی آمدنی میں گھاٹے کی رقم، شہروں کی تعمیر پر خرچ کی گئی رقم، حکومت کے اخراجات کی رقم، پنشن اور دوسرے مختلف بھتوں کی رقمیں شامل تھیں۔

ہندوستان میں صنعتوں کا فروغ

19 ویں صدی کے وسط تک کوئی بھی جدید صنعت ہندوستان میں

قایم نہیں کی گئی تھی۔ 19 ویں صدی کے آخری حصے میں کچھ ایسی صنعتوں کو لگانے کی اجازت دی گئی جو برطانوی صنعتوں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور جن کی حکومت کو ضرورت تھی۔ ان صنعتوں کو بنیادی طور پر حکومت کی امداد اور برطانوی سرمایہ سے قایم کیا گیا۔ یہ صنعتیں سوتی کپڑے، جوٹ اور کوئلے کی کان کنی سے متعلق تھیں۔

موجودہ صدی میں انگریز دو جنگوں میں شریک تھے اس لیے لوہے، فولاد، چمڑے کی چیزوں، سوتی کپڑے اور پٹ سن، چینی، کاغذ، گتا، ماچس وغیرہ کی صنعتوں کی حفاظت (غیر ملکی درآمدی مال پر محصول لے کر) کی گئی۔ چنانچہ ان صنعتوں کی ایک خاص حد تک ترقی ہوئی۔ لیکن مشین اور اوزار بنانے والے کارخانوں کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کو مشین خریدنے، تربیت حاصل کرنے اور سامان درآمد کرنے کے لیے انگلینڈ پر انحصار کرنا پڑا۔

تیسرا باب

ہمارے وسائل

تعارف

ملک کی ترقی کا انحصار دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ قدرتی وسائل اور یہ کہ افرادی قوت ان وسائل کو کس طرح استعمال کرتی ہے اگر قدرتی وسائل بہت زیادہ ہیں اور آبادی اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن وہ محنتی ہے۔ تب لوگوں کا معیار زندگی اونچا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر قدرتی وسائل بہت کم ہوں اور آبادی مقابلتاً زیادہ ہو تو لوگوں کو اپنا معیار زندگی بہتر کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ جاپان ایسے ہی ملکوں میں سے ایک ہے جس نے بڑے ملکوں میں اپنا مقام خود بنایا ہے۔ اس طرح ملک کی ترقی، قدرتی وسائل اور ان کے استعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آبادی کا سائز، اس کی صلاحیت، علم، کام کرنے کی خواہش اور قوت کی بھی بہت اہمیت ہے۔

یہاں پر ہم ہندوستان کی افرادی قوت اور قدرتی وسائل کا مختصراً ذکر کریں گے۔ اگلے باب میں ہم ترقیاتی عوامل اور اس پس منظر میں ترقی کی ضرورت کا تجزیہ کریں گے۔

افرادی قوت (آبادی)

دنیا میں ہندوستان زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا چین کے بعد دوسرا درجہ ہے۔ یہاں تقریباً 60 کروڑ کی آبادی ہے جو دنیا کی آبادی کا 14 فیصدی ہے۔ بدقسمتی سے آبادی کے تناسب سے ہمارے پاس بہت کم زمین ہے جو دنیا کی کل زمین کا صرف 2.4 فیصدی ہے۔

اس باب میں افرادی قوت کے دو پہلوؤں پر غور کیا جائے گا۔ پہلا آبادی کی خصوصیات جو 1971 کی مردم شماری سے ظاہر ہوتی ہیں۔ دوسرا معیشت پر آبادی کا حقیقی بوجھ یا انحصار۔

آبادی کی خصوصیات

ہر دس سال بعد ہندوستان میں مردم شماری ہوتی ہے۔ سب سے پہلی مردم شماری 1871 میں ہوئی تھی اور سب سے آخری 1971 میں ہوئی۔ ہماری آبادی کی خصوصیات جو 1971 کی مردم شماری کے بعد سامنے آئی ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1. سائز

1971 کی مردم شماری کے تحت ہندوستان کی آبادی 54.7 کروڑ ہے یہ گذشتہ 50 سال سے بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہر تین سکنڈ میں دو بچے پیدا ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے آبادی کے اضافہ سے متعلق معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

مردم شماری کا سال	اضافہ (+) یا کمی (–) (کروڑوں میں)	پچھلی مردم شماری کے مقابلے میں فیصد اضافہ (+) یا کمی (–)
(i)	(ii)	(iii)
1901	—	
1911	+ 1·37	5·74
1921	– 0·08	(–) 0·31
1931	+ 2·77	11·02
1941	+ 3·16	14·20
1951	+ 4·25	13·34
1961	+ 7·79	21·50
1971	+10·79	24·57

("بھارت 1974" ت)

کالم (ii) کا جدول پچھلی مردم شماری کے مقابلے میں کمی یا زیادتی کی تعداد دکھاتا ہے جبکہ (iii) میں تعداد فیصد سے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ گذشتہ ستر سالوں میں سوائے 1921 کے جب آبادی تقریباً 8 لاکھ یا 0·3 فیصدی گھٹی - یہ سال "عظیم تقسیم کا سال" کہلاتا ہے۔ اس کے بعد ہر زمانے میں آبادی مسلسل بڑھتی رہی کالم (iii) سے آپ کو پتہ چلے گا کہ 1951 کے بعد سے نہ صرف آبادی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اضافے کی شرح بھی بڑھ گئی ہے۔ آبادی کے اضافے کی بڑھتی ہوئی شرح سے ہماری ترقی اور پائیداری کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

2- شرح پیدائش اور اموات

کسی بھی ملک میں آبادی کا اضافہ تین چیزوں پر منحصر ہے۔ شرح پیدائش

شرح موت اور ہجرت۔ ہندوستان میں ہجرت سے مراد وہ لوگ ہیں جو ملک سے
باہر گئے اور وہ لوگ جو ملک میں باہر سے آئے مگر یہاں مہاجرین کی تعداد زیادہ نہیں ہے
اس لیے یہاں آبادی شرح موت کے مقابلے میں شرح پیدائش میں اضافے پر منحصر ہے۔
ہر ایک 1000 آدمیوں کے پیچھے جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں اُسے شرح پیدائش کہتے ہیں
اور جتنے لوگ مرتے ہیں اُسے شرح موت کہتے ہیں۔ بہت سی بیماریوں پر قابو پا لینے کی
کی وجہ سے گذشتہ چند سالوں سے شرح موت میں کمی آئی ہے۔ اور شرح پیدائش کے
اضافے کو روکا نہیں گیا۔ مردم شماری کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ 1960
-1951 کے درمیانی عرصے میں ہر 100 آدمیوں پر 19 آدمیوں کا اضافہ ہوا۔ لیکن 1970
-1961 کے درمیانی عرصے میں یہ تعداد بڑھ کر 24.6 آدمی ہو گئے۔ اس طرح ہماری آبادی
میں اضافہ بڑھتی ہوئی قدرتی شرح سے ہو رہا ہے۔ (1)

3. عورتوں و مردوں کا تناسب

ہماری آبادی کی ایک اور خصوصیت عورتوں سے زیادہ مردوں کی آبادی ہے
1971. کے اندازے کے مطابق ہر 1000 مردوں کے لیے 932 عورتیں ہیں۔ عورتوں
کی تعداد امریکہ، روس اور برطانیہ میں زیادہ ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کے مقابلہ
میں مردوں کی تعداد میں زیادتی اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ لڑکیوں کو خاندان میں
وہ مقام حاصل نہیں جو لڑکوں کو حاصل ہے۔ شادی کا کم عمر میں ہونا اور زچہ کی دیکھ
بھال نہ ہونا بھی عورتوں کی موت کی شرح میں اضافہ کرتا ہے۔

4. آبادی کی گنجانی

ملک کے مختلف علاقوں میں آبادی بھی مختلف ہے۔ مغربی بنگال، کیرالا اور دہلی
میں آبادی بہت گنجان ہے۔ راجستھان اور مدھیہ پردیش وغیرہ میں مقابلتاً کم گنجان ہے۔

---

(1) شرح موت اور شرح پیدائش کا فرق قدرتی اضافہ (+) یا کمی (-) کہلاتا ہے

1971 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ہر مربع کلومیٹر میں اوسطاً 182 افراد رہتے ہیں۔ اس معاملے میں ہندوستان کی حالت اتنی بُری نہیں ہے جتنی جاپان، اٹلی اور برطانیہ کی ہے۔ لیکن یہ پھر بھی امریکہ، روس اور کنیڈا کی طرح نہیں ہے، جہاں بہت کم لوگ ایک مربع کلومیٹر زمین پر آباد ہیں۔

5. شہری اور دیہی آبادی

1971 کی مردم شماری کے مطابق، ہندوستان کی 80 فیصدی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ اگرچہ گذشتہ پچاس سال سے شہروں کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ پھر بھی ہندوستان آج بھی ایسا ملک ہے جہاں زیادہ تر لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں دیہاتیوں کو شہر کی طرف کھینچتی ہیں۔ اور ان کو کام اور ملازمتیں فراہم کرتی ہیں۔ تاہم اس ملک میں صنعتی کارخانے زیادہ نہیں ہیں جن کی وجہ سے دیہاتوں سے شہروں کی طرف زیادہ آبادی منتقل ہو سکتی۔

آبادی۔ ہندوستان کے لیے مسئلہ یا وسیلہ؟

آبادی معاشی ترقی کا اہم عامل ہے ایک نظریے کے مطابق جتنی زیادہ آبادی ہوگی اور وہ جتنی محنتی ہوگی اتنی معاشی ترقی کی شرح اونچی ہوگی۔ کام کرنے والی آبادی میں اضافہ کی صورت میں مزدوروں، منتظموں، تکنیکی کاریگروں، تاجروں، بچت کرنے والوں اور سرمایہ کاروں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سب ملکی ترقی کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ کیونکہ آبادی ایک وسیلہ اور دولت ہے جسے ایک قوم کی افرادی قوت کہتے ہیں۔ چین دنیا کی سب سے بڑی آبادی والا ملک ہے۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اپنی افرادی قوت کو پیداواری مقاصد میں استعمال کر سکے۔

اس کے برعکس، بڑی آبادی ملک کے لیے خطرہ بھی بن سکتی ہے۔ ایسا اُس وقت

ہوتا ہے جب لوگوں میں خوبیاں کم ہوں۔ اگر قدرتی وسائل بھی کم ہوں تو صورتحال بڑی بھیانک ہوسکتی ہے۔ ہمارے ملک میں پُرخطر کام کرنے والے زیادہ نہیں ہیں اور ایسے سرمایہ کار بھی کم ہیں جو قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے کے لیے نفع بخش موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کثیر وسائل کی دریافت نہیں کی جا سکے گی۔ اور جو کچھ بھی تھوڑے بہت وسائل موجود ہیں ان کا بھی ٹھیک ڈھنگ سے استعمال نہیں ہوگا۔ دونوں حالتوں میں دولت کم ہو گی۔ اور عوام کی آمدنی کم رہے گی۔ لوگ غریب کے غریب رہیں گے۔ اور صرف وہی چند لوگ جو پرخطر کام کرنے اور سرمایہ کاری کرنے والے ہیں امیر بنے رہیں گے۔ سماجی اور معاشی حالت خراب رہے گی۔ لوگوں کو کھانے کے لیے خوراک، رہنے کے لیے اچھی جگہ، پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں میسر آئیں گے۔ دوائیوں، اسپتالوں، اسکولوں سڑکوں، تفریح گاہوں کے متعلق تو کہنا ہی فضول ہے۔ ایسی حالت میں بڑھتی ہوئی آبادی ایک عذاب بن جائے گی۔ تب اسے ایک سنگین مسئلہ تسلیم کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کی حالت کیا ہے؟ ہندوستان قطعی طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے کا سامنا کر رہا ہے۔ اب یہ آبادی اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بوجھ ہے۔ ہماری قومی آمدنی بڑھ رہی ہے لیکن آبادی اُس سے زیادہ رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے بہت کم فی کس آمدنی۔ حقیقت یہ ہے کہ اوسط ہندوستانی ہمیشہ سے غریب ہے آبادی کے بڑھنے سے اُن لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے جن کو روزگار کی تلاش ہے انھیں کوئی کام نہیں مل پاتا۔ تمام فالتو پیداوار، فالتو آبادی کی نذر ہوجاتی ہے اور کچھ بھی بچ نہیں پاتا۔ اس لیے سرمایہ کاری کم ہوتی ہے۔ اور جب سرمایہ کاری کم ہوگی تو نئے روزگار فراہم کرنے والے کارخانے بھی کم ہوتے ہیں

اور اس طرح قدرتی طور سے بے روزگاری بڑھتی ہے۔

ہندوستانی آبادی کا ایک افسوسناک پہلو ان لوگوں کا بڑھتا ہوا تناسب ہے جو کچھ بھی نہیں کماتے یعنی وہ لوگ جو اپنے خاندان کے کمانے والے افراد کی آمدنی پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے 15 سال کی عمر سے چھوٹے اور 60 سال کی عمر سے بڑے ہیں۔ ملک کی کل آبادی میں ایسے لوگوں کا جو تناسب ہے اُسے انحصاری بوجھ ______ کہتے ہیں۔ 1961 میں یہ انحصاری بوجھ ہندوستان میں 57.3 فیصدی تھا جو 1971 میں بڑھ کر 66.5 ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں خاندانوں کی بچت کم ہو جائے گی اور جو خاندان گذارہ نہیں کر سکیں گے، انھیں بچّوں اور بوڑھوں کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے مجبوراً قرض لے کر گذارہ کرنا پڑے گا۔

مسلسل بڑھنے والی آبادی ہمیشہ سے ہمارے قلیل وسائل پر بھاری بوجھ ہے۔ اور کافی رقم، تعلیم، مکان، کپڑے، صحت عامہ کی سہولتوں اور دوسری ضروریات زندگی پر خرچ کرنی پڑتی ہے۔ آبادی اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ہمیں ہر سال ایک کروڑ ٹن اناج، 25 لاکھ مزید مکان، کروڑوں میٹر مزید کپڑا۔ تقریباً ایک لاکھ نئے اسکول اور تین لاکھ مزید ٹیچروں کی ضرورت پڑے گی۔

ظاہر ہے اگر ملک ان مسائل میں الجھا رہا تو وہ کسی طرح بھی معاشی ترقی نہیں کر سکے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ عوام کو کچھ زیادہ کھانا، کچھ زیادہ کپڑا اور کچھ زیادہ مکان فراہم کر سکے گا۔ ایسی حالت میں جدید صنعتیں یا مشینوں کی پیداوار، ہوائی اور پانی کے جہاز، ریلوے انجن، کھاد، ٹریکٹر وغیرہ کے کارخانے بہت زیادہ نہیں ہوں گے۔ ان کی تعداد میں اضافہ کے لیے آبادی کے اضافے کی شرح میں کمی کرنی ہوگی۔ اور موجودہ افرادی قوت کو تربیت دینی پڑے گی اور ان کو اپنے قدرتی وسائل کو کام میں لانے کے لیے ملازمتیں دینی ہوں گی۔ اب ہم اپنے قدرتی وسائل پر غور کریں گے جو معاشی ترقی کے لیے

دوسرا عامل ہے۔

ہمارے قدرتی وسائل

قدرتی وسائل میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو ہمیں قدرت نے دی ہیں۔ یعنی زمین پانی، معدنیات، جنگلات، آب و ہوا، بارش، سمندر اور زمین میں چھپی ہوئی دولت۔ ہم ان قدرتی تحفوں کے بارے میں جان بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی جان سکتے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہمیں بہت سے قدرتی وسائل کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں۔ اور کچھ عرصے کے بعد ان کی دریافت کر لی جائے۔

اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدرتی وسائل بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جب تک کہ انسان خود ان کو استعمال کرنے کے لیے سخت محنت نہ کرے۔ وہ بے کار پڑے رہتے ہیں اور معاشی ترقی میں مددگار نہیں ہو سکتے۔ ایسی حالت میں کہنا پڑے گا کہ ملک دولت مند ہوتے ہوئے بھی غریب ہے۔ قدرتی وسائل کے بارے میں آپ پہلے ہی اپنی جغرافیہ کی کتاب میں پڑھ چکے ہوں گے۔ اس لیے ہم یہاں پر ان کے بارے میں مختصر طور پر ہی بیان کریں گے۔

زمینی وسائل

وزارتِ خوراک و زراعت کے سروے کے مطابق ہندوستان کی کل زمین کا تقریباً 44.8 فیصدی رقبہ زراعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس حساب سے ہر ایک آدمی کے حصے میں اوسطاً صرف 0.29 ہیکٹر زمین آتی ہے۔ کچھ ترقی یافتہ ملکوں کی اوسط زمین مندرجہ ذیل ہے۔

ملک	فی کس اوسط قابل کاشت زمین	
امریکہ	0.89	ہیکٹر
روس	1.03	〃
کینڈا	2.12	〃
آسٹریلیا	3.39	〃

آپ جانتے ہیں اگرچہ ہندوستان کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا لگ بھگ 14 فیصدی ہے لیکن اس کی زمین دنیا کی کل زمین کا صرف 2.4 فیصدی ہے۔ اس زمین پر آبادی کا زیادہ دباؤ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ رائے دی جاتی ہے کہ قابل کاشت زمین کے رقبہ میں اضافہ کیا جائے اور اس وقت جو زمین کاشت کرنے کے قابل نہیں ہے اور استعمال میں نہیں لائی جاتی ہے۔ اس کو قابل کاشت بنایا جائے۔ اس سلسلے میں انتہائی اہم تحقیقات کی جاچکی ہیں اور یہ معلوم ہوا ہے کہ کامیابی کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس جو قابل کاشت زمین موجود ہے اُسے زیادہ زرخیز بنایا جائے اس سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔ کھیتی کے نئے طریقوں، گہری کھیتی (intensive agriculture,) کھاد کا استعمال، فصلوں کی ادلا بدلی کے سلسلے میں کچھ تجربات کیے گئے ہیں اور اس مقصد میں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

جنگلات

جنگلات ملک کی دولت ہوتے ہیں۔ ان کی معاشی اہمیت اس وجہ سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ یہ بہت سی صنعتوں کے لیے کچا مال فراہم کرتے ہیں۔ ان سے مختلف نباتات حاصل ہوتی ہیں، جیسے کاغذ بنانے کا گودا، ربڑ، گودا۔ تیل۔ گوند

ال، ربڑ، کھیل کود کی چیزیں بنانے اور دیا سلائی کے لیے لکڑی وغیرہ ان صنعتوں کی پیداوار کو برآمد بھی کیا جاتا ہے اور اس سے کافی غیر ملکی زرمبادلہ بھی کمایا جاتا ہے۔

خام مال فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جنگلات مٹی کے کٹاؤ کو بھی روکتے ہیں اور سیلابوں کو روکنے میں مدد کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بارش بھی ہوتی ہے۔ جنگلات سے لاکھوں انسانوں کو روزگار بھی ملتا ہے۔ سیکڑوں آدمی جنگلات سے لکڑی کاٹ کر اور ان کو فروخت کرکے روزی کماتے ہیں مگر زیادہ لوگ ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں جہاں جنگلات کی لکڑی خام مال کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بے پناہ جنگلاتی دولت ہے۔ یہ ملک میں 23 فیصدی زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں جنگلاتی دولت موجود ہے۔ مگر اس سے ہماری تمام ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ موجودہ جنگلات کو ختم ہونے سے روکا جائے اور ساتھ ہی ہر سال درخت لگا کر جنگلات میں اضافہ کیا جائے۔ اس وجہ سے حکومت ایک طرف تو جنگلات کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال پر دھیان دے رہی ہے دوسری طرف ہر سال جنگلات اگاؤ مہم، چلا کر جنگلات کے رقبہ میں اضافہ کر رہی ہے۔ 1952 میں جنگلات کے متعلق قومی پالیسی کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ جنگلات کے علاقے کو بڑھا کر کل زمین کے رقبہ کا 33 فیصدی کر دیا جائے۔

معدنیات

وسائل کی فہرست میں معدنیات کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت ملک کی ترقی کی بنیاد ہے اور اس کے لیے ذخائر جیسے کچا لوہا اور کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں ہمارے ملک میں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ اس

کے علاوہ تانبا، ابرک، میگنیز، سیسہ وجستہ اور باکسائٹ بھی کثیر مقدار میں موجود ہیں
کم اہمیت والی معدنیات کی بھی اس ملک میں کمی نہیں ہے۔ بہت سے ذخائر
ہمیں ابھی دریافت کرنے ہیں۔ ملک میں پٹرول کی کمی ضرور ہے۔ بہت سے سرکاری
محکمے معدنی دولت کو ملک میں تلاش کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ ان کی کوششوں کے
نتیجہ میں گذشتہ بیس پچیس سال میں معدنی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔

کانوں میں لگ بھگ 7 لاکھ لوگ کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کی
صنعتی ترقی خاص طور سے معدنیات پر منحصر ہے۔ حکومت کی معدنیات سے متعلق
پالیسی میں ان دونوں پہلوؤں کا خاص طور سے دھیان رکھا گیا ہے۔ ضرورت ہے
کہ نئے معدنی ذخائر اور معدنی رقبوں کا جلد از جلد پتہ لگایا جائے۔ ہمارا مقصد خودکفالت
ہونا چاہیے۔ کوئلہ اور تیل جیسی اہم معدنیات کے معاملے میں یہ اور بھی ضروری ہے۔
خام تیل حاصل کرنے کے لیے بمبئی کے کھلے سمندر میں ہم کافی کوشش کر رہے ہیں۔
آپ نے "ساگر سمراٹ" کا نام ضرور سنا ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا پانی کا جہاز ہے جو
بمبئی کے قرب وجوار کے سمندر میں تیل کی تلاش میں مشغول ہے۔ حال ہی میں بمبئی
کے ساحل سے تیل حاصل ہونا شروع ہوگیا ہے اس ذخیرے سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

مچھلیاں

ہمارے ملک میں بہت سے دریا بہتے ہیں اور ہمارے ملک کی بہت بڑی سرحد
سمندر سے لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے ہمارے ملک میں مچھلی کے کافی ذخائر ہیں۔ اندازہ
ہے کہ ہم اپنے کل ذخیرہ کی 8 یا 10 فیصدی مچھلیاں پکڑ پاتے ہیں۔ یہ ذخیرہ ختم
ہونے والا نہیں ہے، اس لیے اگر ہم کوشش کریں تو مچھلی پکڑنے کے سائنٹفک
طریقوں کے ذریعہ اس میں اور اضافہ کرسکتے ہیں۔

ہماری مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا زراعت پر دباؤ مچھلی کو بحیثیت خوراک کے استعمال کر کے کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر مچھلی پالنے اور ان کو پکڑنے پر خاص دھیان دیا جائے تو مچھلی سے نہ صرف خاصی بڑی تعداد میں خوراک حاصل ہوگی بلکہ پروٹین اور معدنیات سے بھرپور غذا بھی ملے گی۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مچھلی سے تیار ہونے والی پیداوار جیسے ڈبہ بند مچھلی اور دوائیوں کی غیر ملکوں میں بڑی مانگ ہے۔ اگر ہم پیداوار کے نئے طریقے اپنائیں تو مچھلی پکڑنا ہمارے لیے غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کا ایک بہت اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اندازہ ہے کہ لگ بھگ 10 لاکھ لوگ مچھلی پکڑنے، مچھلی پالنے اور مچھلیوں سے متعلق کاموں میں مشغول ہیں۔ سمندری پیداوار کو فروخت کرنے سے ہر سال تقریباً 70 کروڑ روپے کا غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ مچھلی پالنا ہندوستانی معیشت کا آنے والے پنج سالہ منصوبے کے تحت ایک اہم پیداواری سیکٹر بن جائے گا اور اس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

طاقت

اس زمانے میں معاشی ترقی کے لیے تیل، پانی، کوئلہ اور ایٹمی طاقت کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ ان چیزوں کی ہمارے ملک میں کیا حالت ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں کوئلے کے زبردست ذخائر ہیں لیکن اسے ہماری بڑھتی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس سے آہستہ آہستہ یہ کوئلے کی کانیں خالی ہو رہی ہیں۔ یہ ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ہم نے کوئلہ کافی گہرائی سے باہر نکال لیا ہے۔ اور اب کوئلہ نکالنے کی لاگت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہمارا زیادہ تر کوئلہ اچھی قسم کا نہیں ہے کوئلہ کی باربرداری کی لاگت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔

معدنی تیل نے آج دنیا کی سیاست میں بڑا اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ اس کو "سیال سونا" کہتے ہیں اور جن ممالک کے پاس تیل کے ذخائر ہیں اب وہ امیر ترین ملک ہیں۔ موٹریں، ہوائی جہاز وغیرہ تیل کی مدد سے چلتے ہیں۔ اور اور بہت سی کیمیائی صنعتوں میں بھی یہ تیل استعمال ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی تیل کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہم اپنی ضرورت کا ایک تہائی تیل پیدا کرتے ہیں۔ باقی ضرورت کا تیل ہم درآمد کرتے ہیں۔ اسی لیے حکومت تیل کے ذخائر کو بہت تیزی سے تلاش کر رہی ہے۔ تیل کی صفائی کے کارخانے بھی قائم ہو رہے ہیں۔ تیل کی صفائی کے کارخانے پبلک سیکٹر میں نن مانی (گوہاٹی) برونی (بہار) کویالی (گجرات) اور کوچین میں قایم کیے گئے ہیں۔ تیل کی سپلائی کے لیے پائپ لائنیں بھی بچھائی گئی ہیں۔ اگرچہ ان کوششوں کے نتائج میں حالت کچھ بہتر ہوئی ہے مگر پھر بھی غیر اطمینان بخش ہے۔

ہماری عظیم آبادی کو دیکھتے ہوئے طاقت کے وسائل بہت کم ہیں۔ مگر قدرت نے پانی کے عظیم ذخائر سے ہمیں نوازا ہے۔ ہمارے زیادہ تر دریا پورے سال بہتے رہتے ہیں۔ ہم اس پانی سے بجلی پیدا کرسکتے ہیں اور برقی طاقت کی صنعتوں کو پھیلانے کے کام میں لاسکتے ہیں۔ یہ آبی برقی طاقت بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کی پیداواری لاگت بہت کم ہے۔ تھرمل بجلی کی پیداوار میں کوئلہ اور تیل کی باربرداری کا خرچ بہت کم ہوگیا ہے۔ ہائیڈرو الیکٹرک کے دوسرے فائدے یہ ہیں کہ بجلی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ سینچائی کی آسانیاں، سیلابوں پر کنٹرول، زمین کی حفاظت وغیرہ بھی ہوتی ہے۔

ابھی تک ہم اپنے پانی کی قوت کا بہت کم حصہ استعمال کرنے کے قابل ہوسکے ہیں یعنی ایک اندازہ کے مطابق اس کا صرف ایک تہائی حصہ

استعمال کیا جا سکتا ہے۔ 1950ء سے اس طرف خاص طور سے دھیان دیا جا رہا ہے۔ اور خاصی رقم اس پر خرچ ہو رہی ہے۔ بہت سے کثیر المقاصد دریائی منصوبوں کے اطمینان بخش نتائج نکلے ہیں۔

بھاکڑہ ننگل، پنجاب میں۔ دامودر وادی، بنگال میں۔ ہیرا کنڈ، اڑیسہ میں، تنگ بھدرا اور ناگرجن ساگر، آندھرا پردیش میں۔ چمبل، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں۔ کوسی، بہار میں اور ریہنڈ، اتر پردیش میں، ملک کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

نیوکلائی طاقت

طاقت کا یہ نیا ذریعہ ہے۔ اسے سائنسی اور تکنکی ترقی کا ایک عظیم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے سائنسداں اس میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے ایک کامیاب نیوکلائی تجربہ پوکھران (راجستھان) میں کیا ہے۔ بدقسمتی سے دنیا نے ہمارے اس تجربہ سے ہمارے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نیوکلائی طاقت کو پُرامن اور ترقیاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ معدنیات (یورانیم، تھوریم، برلیم وغیرہ) جو نیوکلائی طاقت پیدا کرنے میں کام آتی ہیں ہمارے ملک میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم نے پہلے ہی ٹرومبے (بمبئی)، کوٹہ (راجستھان) اور کل پکم (تامل ناڈ) میں ایٹمی ریکٹرس قایم کر لیے ہیں۔ اتر پردیش کے نرورا مقام پر ایک نئے نیوکلائی ریکٹر کا منصوبہ قایم کرنے کی تجویز ہے۔ اور یہاں جلد ہی کام شروع ہو جائے گا۔

ہندوستان میں افرادی اور قدرتی وسائل کا یہ مختصر خاکہ یہ بتاتا ہے کہ قدرت نے بے پناہ وسائل سے ہمیں نوازا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ وسائل کی اس دولت کو

کس طرح کام میں لایا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے افراد کو تربیت دینے اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے کاریگر بہت کم کام کرتے ہیں۔ اور اسی لیے یہ دوسرے ملکوں کے کاریگروں کے مقابلے میں بہت کم پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کاریگروں کو کافی خوراک، تربیت اور دوسری سہولیات (جو ترقی یافتہ ممالک کے مزدور کو حاصل ہیں) دیں تو ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا اور پیداوار بھی بڑھے گی۔

چوتھا باب

معاشی ترقی کی ضرورت

تعارف

ہماری معاشی کوششوں کا مقصد لوگوں کے لیے ضروری صرف کی چیزوں اور خدمات کا پیدا کرنا ہے۔ ایک معینہ مدت (عام طور پر ایک سال) میں معیشت کے مختلف شعبوں (جیسے زراعت، کان کنی، مچھلیاں پکڑنا جنگلات، صنعتیں اور دوسرے کام میں چیزوں اور خدمات کی کل پیداوار کو قومی پیداوار کہتے ہیں۔ یہی چیزیں اور خدمات ہیں جو سماج کے موجودہ صرف اور دوسرے بہت سے مقاصد کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔ اس لیے وسیع طور پر ایک معینہ مدت میں کی گئی معاشی ترقی کو ہی ایک معیشت کی قومی پیداوار کہا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر قومی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ آبادی میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا ہے (یا زیادہ تیزی سے) تب فی کس چیزوں اور خدمات (کل قومی پیداوار ÷ کل آبادی = فی کس قومی آمدنی) کی فراہمی نہیں بڑھے گی۔ اس لیے معاشی ترقی کو ناپنے کا بہتر پیمانہ وہ فی کس آمدنی ہے جس میں آبادی میں اضافے کا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ بہرحال یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ ایک معینہ مدت میں کسی معیشت کا زیادہ سے زیادہ چیزوں

کس طرح کام میں لایا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے افراد کو تربیت دینے اور ان کی کارکردگی
کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے کاریگر بہت کم کام کرتے ہیں۔ اور اسی لیے یہ
دوسرے ملکوں کے کاریگروں کے مقابلے میں بہت کم پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے
کاریگروں کو کافی خوراک، تربیت اور دوسری سہولیات (جو ترقی یافتہ ممالک کے
مزدور کو حاصل ہیں) دیں تو ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو گا اور پیداوار بھی بڑھے گی۔

چوتھا باب

معاشی ترقی کی ضرورت

تعارف

ہماری معاشی کوششوں کا مقصد لوگوں کے لیے ضروری صرف کی چیزوں اور خدمات کا پیدا کرنا ہے۔ ایک معینہ مدت (عام طور پر ایک سال) میں معیشت کے مختلف شعبوں (جیسے زراعت، کان کنی، مچھلیاں پکڑنا جنگلات، صنعتیں اور دوسرے کام) میں چیزوں اور خدمات کی کل پیداوار کو قومی پیداوار کہتے ہیں۔ یہی چیزیں اور خدمات ہیں جو سماج کے موجودہ صرف اور دوسرے بہت سے مقاصد کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔ اس لیے وسیع طور پر ایک معینہ مدت میں کی گئی معاشی ترقی کو ہی ایک معیشت کی قومی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر قومی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ آبادی میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا ہے (یا زیادہ تیزی سے) تب فی کس چیزوں اور خدمات (کل قومی پیداوار ÷ کل آبادی = فی کس قومی آمدنی) کی فراہمی نہیں بڑھے گی۔ اس لیے معاشی ترقی کو ناپنے کا بہتر پیمانہ وہ فی کس آمدنی ہے جس میں آبادی میں اضافے کا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ بہرحال یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ایک معینہ مدت میں کسی معیشت کا زیادہ سے زیادہ چیزوں

کے پیدا کرنے کا انحصار دستیاب پیداواری وسائل (جیسے قدرتی وسائل آبادی ، ٹکنولوجی ، سرمایہ وغیرہ) کی مقدار و معیار پر ہے ۔ اور جسے ہم پیداواری استعداد ('productive capacity'.) کہتے ہیں ۔ ایک مرتبہ جب ایک معیشت کی تمام پیداواری استعداد کو پورے طریقے سے استعمال کر لیا جاتا ہے تو کل پیداوار دی ہوئی شرائط کے مطابق زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے ۔ کل پیداوار (قومی پیداوار) اور فی کس آمدنی میں اس سے آگے کوئی بھی اضافہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب ہم پیداواری وسائل کے معیار و مقدار کو بڑھا کر معیشت کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کر دیں ۔ اس لیے معاشی ترقی کو ناپنے کا بہترین طریقہ پیداواری استعداد کی اس ترقی کو جاننا ہے جو کسی معیشت کی ایک معینہ لمبی مدت میں حاصل کی گئی ہو ۔

ترقی کے عوامل

آپ دیکھیں گے ۔ ترقی کا یہ چکر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ اُسی صورت میں حرکت کرے گا جب اس کو حرکت دینے والی شرائط پوری ہوں گی ۔ مثال کے طور پر کام کرنے والوں میں مہارت ، ایمانداری اور سچائی ہونی چاہیئے ۔ آپ کے خاندان اور اس کو جس کے آپ فرد ہیں ۔ آپ کے کام کرنے کے طریقے پر بھروسہ ہو ۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے عمل کو خاندان اور اس سے بڑے ادارے سماج کی حمایت حاصل ہو ۔ پھر آپ کی بچت کی بھی بہت اہمیت ہے بچتیں ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرتی ہیں ۔ اسی طرح جس طرح ادارے ترقی کے لیے افرادی قوت فراہم کرتے ہیں ۔ آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ صرف سرمایہ خود کچھ نہیں کر سکتا ۔ آپ کو ایک پُل بنانا ہو تو آپ کے پاس کافی فولاد ،

سیمنٹ، اوزار اور آلات وغیرہ بھی ہونے چاہئیں۔ اسے ہم اصل سرمایہ اور بچتوں کو زر اصل کہتے ہیں۔ یہ معاشی ترقی یا معاشی طاقتوں کے لیے ثانوی ضرورت ہے۔
آسانی کے لیے ترقی کے ان تمام عوامل کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔
(a) معاشی اور (b) اداریاتی۔ اب ان پر الگ الگ بحث کریں گے۔

A. معاشی عوامل

اس عنوان کے تحت ہم یہاں مندرجہ ذیل کا ذکر کریں گے۔
(i) قدرتی وسائل (ii) آبادی (iii) سرمایہ اور (iv) تکنولوجی

B. ادارياتی یا غیر معاشی عوامل

اس عنوان کے تحت ہم یہاں مندرجہ ذیل کا ذکر کریں گے۔
(i) سیاسی (ii) سماجی اور (iii) مذہبی ادارے

A. معاشی عوامل

قدرتی وسائل

قدرتی وسائل جو موجود ہیں، جن کو انسان خود پیدا نہیں کر سکتا ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری عوامل ہیں۔ زمین، طاقت، جنگلات اور معدنیات وغیرہ ملک کے قدرتی وسائل ہیں۔ قدرت نے کافی وسائل سے ہمیں نوازا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ معاشی ترقی صرف قدرتی وسائل سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ انسانی جدوجہد کی غیر موجودگی میں یہ وسائل بے کار پڑے رہتے ہیں اور زمین کے نیچے چھپے رہتے ہیں۔ دراصل وسائل ترقی کی راہ دکھاتے ہیں۔

اور یہ بتلاتے ہیں کہ ہمیں کس طرف بڑھنا ہے۔ یہ ایک چیلنج ہے جس کو قبول کرنا یا نہ کرنا انسان پر منحصر ہے۔ وسائل کا اس طرح استعمال کیا جانا چاہیے جس سے لمبے عرصے تک زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو اور اس کا دار و مدار انسانی عقل اور اس کے تکنیکی علم پر ہے۔

آبادی

قدرتی وسائل کو اچھی طرح استعمال کرنے کے لیے انسانی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک حد تک آبادی جتنی زیادہ ہوگی، اتنے ہی اچھے طریقے سے قدرتی وسائل کو کام میں لایا جاسکے گا۔ لیکن آبادی میں اضافہ چیزوں کی طلب میں بھی اضافہ کردیتا ہے۔ اگر پیداوار اسی تناسب سے نہیں بڑھتی تو قیمتیں بھی بڑھ جاتی ہیں اس کے ساتھ ہی اگر روزگار کے مواقع آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ فراہم نہیں کیے جاتے تو بے روزگاری بڑھتی ہے اور بہت سے سماجی و معاشی مسئلے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آج یہی صورت حال ہندوستان کی ہے۔ آبادی بڑھ رہی ہے مگر پیداوار اس حساب سے نہیں بڑھ رہی ہے۔ اور نہ روزگار کے کافی مواقع ہی سامنے آرہے ہیں۔ اگرچہ افرادی قوت موجود ہے مگر پھر بھی ہم اپنے قدرتی وسائل سے فائدہ نہیں اُٹھا رہے ہیں۔

سرمایہ

موجودہ زمانے میں اشیائی سرمایہ کے بغیر معاشی ترقی ناممکن ہے۔ فیکٹریاں، مشینیں، مختلف سامان، ڈیم (بند) ریلوے، طاقتی وسائل وغیرہ سب اشیائی سرمایہ ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن نے اپنے پہلے پنج سالہ منصوبہ میں یہ بات اچھی طرح واضح

کردی تھی۔ اس نے لکھا ہے:" کسی قوم کی مادی ترقی اور پیداوار کا انحصار اس کے سرمایہ پر ہے۔ یعنی فی کس کتنی زمین ہے۔ اور مشینوں، عمارتوں، اوزاروں، کارخانوں، ریل کے انجنوں، سینچائی کی سہولتوں، بجلی گھروں اور رسل ورسائل کے ذرائع کی شکل میں کتنے پیداواری وسائل ہیں۔ جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا اتنی ہی زیادہ افراد کی قوت پیداوار ہوگی۔ اور اس کے نتیجے میں اتنی ہی زیادہ چیزیں اور سہولتیں مہیا ہوں گی۔" اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سارا معاشی نظام سرمایہ کی تشکیل پر منحصر ہے۔

سرمایہ کی تشکیل کی بنیاد یہ ہے کہ سماج کے دستیاب وسائل کا ایک حصہ موجودہ صرف کی اشیا کی پیداوار پر لگانے کی بجائے اشیائی سرمایہ پر لگایا جائے تاکہ پیداواری استعداد میں اضافہ ہوسکے اور مستقبل میں مزید اشیائے صرف پیدا کی جاسکیں۔ جب کوئی ملک اپنے موجودہ پیداواری وسائل کو اشیائے صرف کی پیداوار کے بجائے اشیائی سرمائے کی پیداوار پر لگاتا ہے تو اول الذکر کی پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سماج کو اپنی ضرورتوں کو کم کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے سماج کے نظریہ کے مطابق، سرمایہ کی تشکیل پیداواری وسائل کو اشیائے صرف کی فوری ضرورت کے استعمال سے بچاکر اسے اشیائی سرمایہ کی پیداوار میں لگانا ہے تاکہ مستقبل میں پیداوار میں اضافہ ہو۔

سرمائے کی تشکیل کے طریقے کو ایک آسان مثال سے بتایا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک گاؤں ہے جس میں قابل کاشت زمین ہے۔ کچھ سادہ آلات اور اوزار ہیں جن سے کاشت کی جاتی ہے اور کچھ بیج وغیرہ ہیں۔ ان پیداواری وسائل (زمین، اوزار، بیج اور افرادی قوت) سے گاؤں والے زیادہ سے زیادہ 100 کوئنٹل اناج ہر سال پیدا کرتے ہیں۔ سارے گاؤں والے مل کر

کھیت کی سینچائی کے لیے تین مہینے میں ایک کنواں بناتے ہیں تو پیداوار میں 10 کوئنٹل سالانہ کا اضافہ ہو جاتا ہے (100 کوئنٹل سے 110 کوئنٹل سالانہ) اس مثال سے صاف ظاہر ہے اگر ایک گاؤں ایک کنواں بنانا چاہے تو اس کی کل پیداوار میں 25 کوئنٹل کی کمی (100 × 3 مہینے / مہینے) ہو جائے گی۔ اس لیے کنویں کی تعمیر کے دوران گاؤں والوں کو اپنے صرف میں کمی کرنی پڑے گی۔ جبکہ بعد میں وہ زیادہ اچھی زندگی گذار سکیں گے۔

آج کی پیچیدہ معیشت میں، بچت اور سرمائے کی تشکیل کا طریقہ ایسی شکل اختیار نہیں کرتا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس معیشت میں روپے کے لین دین سے تمام کام ہوتے ہیں۔ افراد اور گھرانے اپنی آمدنی نقد رقم میں وصول کرتے ہیں جس کو وہ چاہیں خرچ کریں یا بچالیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انفرادی یا خاندانی بچتوں سے خود بخود سرمایہ کاری نہیں ہو جاتی۔ کوئی شخص تاجر یا کسان ہے تو وہ اپنی بچت کو کاروبار یا کاشت کاری میں لگا دے گا۔ لیکن اگر وہ کسان اور تاجر نہیں ہے تو اس کو ایسا طریقہ درکار ہے جس سے وہ اپنی بچت کو کسی کاروبار میں لگا سکے۔ دوسرے لفظوں میں انھیں ایسا کرنے کے لیے کسی درمیانی آدمی یا ادارے کی ضرورت پڑے گی۔ بنک، ڈاک گھر، بیمہ کمپنیاں وغیرہ ایسی خدمات کے لیے ہی ہوتی ہیں ایسے ادارے لوگوں کو بچتوں کے لیے متوجہ کرتے ہیں۔ یہ ادارے ان بچتوں کو بیوپاریوں، کسانوں اور پیداکاروں کو قرض کے طور پر دیتے ہیں۔ جس ملک میں یہ ادارے کافی تعداد میں اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں وہاں بچت زیادہ ہوتی ہے۔ سرمایہ کاری بھی خوب ہوتی ہے۔ ایسے اداروں کی غیر موجودگی میں بھی لوگ بچت کرتے ہیں مگر اپنی بچت کو وہ زیورات اور سونا خریدنے میں لگاتے ہیں یا دبا کر رکھتے ہیں۔ بہر حال اس طرح بچتیں غیر پیداواری ہو جاتی ہیں اور ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ایک دوسری بات جس پر ہم زور دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کی طرف دھیان دلانا ہے کہ سرمایہ کے اضافے کے لیے ہمیں کچھ قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ سرمایہ کاری سے آمدنی بڑھتی ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ آمدنی کی اس زائد رقم (marginal) کو مزید سرمایہ کاری میں لگا دیا جائے۔ اس طرح آمدنی اور بڑھے گی۔ جیسے آمدنی کی زائد رقم کو ہم کاروبار میں لگاتے جائیں گے۔ ویسے ویسے آمدنی میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس طرح یہ عمل معاشی ترقی کا باعث ہوگا۔ ایک مثال سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی فرض کیجئے ہم کاروبار میں 5,00,000 روپے کا سرمایہ لگاتے ہیں۔ (یہ ہمارا ابتدائی اصل سرمایہ ہے) اور اس سے زمین، عمارت اور مشینیں خرید تے ہیں۔ اور سال بھر کام کرنے کے بعد ہمیں 50,000 روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ یعنی 10 فی صدی سالانہ۔ اگر ہم اس آمدنی کو کھا جائیں یا خرچ کر دیں یا صرف کر دیں تو آئندہ آمدنی انہی 5 لاکھ روپے پر وہی پچاس ہزار روپے ہو گی اور ہمارا اصل سرمایہ اتنا ہی رہے گا۔ لیکن اگر ہم آمدنی کا 20 فی صدی یعنی 10,000 روپے بچالیں اور اپنے اصل سرمایہ میں شامل کر دیں تو ہمارا اصل زر یا سرمایہ 5,10,000 روپے ہو جائے گا۔ اگر اُسی سرمایہ پر اُسی 10 فیصد شرح سے آمدنی ہو تو رقم 51,000 روپے ہو گی۔ اس طرح ہماری آمدنی میں مزید ۱۰ فیصدی یعنی 1,000 روپے کا اضافہ ہوگا۔ چنانچہ اب ہمارے خرچ کے لیے 40,000 روپے ہی کافی ہیں۔ اور 11,000 روپے جو زائد آمدنی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے فالتو ہے تو ہم اس سال اپنے اصل سرمایہ میں مزید گیارہ ہزار کا اضافہ کر دیں گے۔ جس میں ایک ہزار روپے کا زائد منافع بھی شامل ہے۔ بڑھتی ہوئی آمدنی کے اس عمل سے ایک ساتھ دو نتیجے نکلتے ہیں۔

(i) کل بچت 10,000 روپے سے بڑھ کر 11,000 روپے ہوگی

کل آمدنی 50,000 روپے سے بڑھ کر 51,000. روپے ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اوسط شرح بچت (کل بچت/کل آمدنی) 20 فیصدی (10,000 روپے/آمدنی 50,000 روپے) سے بڑھ کر 21·6 فیصدی (11,000 روپے/آمدنی 51,000 روپے) ہوجائے گی۔ اور

(ii) مزید آمدنی 1000 روپے ہوئی اور مزید بچت بھی 1000. روپے ہوئی دوسرے الفاظ میں اس طرح حاشیائی شرح بچت (marginal savings rate) (زائد بچت/زائد آمدنی) کا معیار بہت اونچا یعنی 100 فیصدی یعنی 1000 روپے پر 1000 روپے ہوگیا ہے۔

اوپر کی مثال سے واضح ہوگیا ہے۔ اگر آمدنی میں لگاتار اضافہ کرنا ہے تو بچت کی شرح بڑھانی پڑے گی۔ اورحاشیائی شرح بچت میں اور بھی تیزی سے اضافہ کرنا ہوگا۔

کم معاشی ترقی کی ایک اہم وجہ سرمایہ کی کم تشکیل ہے جو کہ کم آمدنی اور کم بچت کی وجہ سے سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں فی کس آمدنی بہت کم ہے۔ یہ قطعی قدرتی بات ہے کہ بعض لوگوں کی بچت بالکل نہیں ہے یعنی صفر ہے اور ان میں سے بعض کی بچت منفی بھی ہوگی۔ چونکہ بچت کم ہے اور سرمایہ کاری بھی کم ہے۔ اس لیے آمدنی بھی کم رہے گی۔ برائی کا یہ ایک چکر ہے جس میں ہمارے لوگ پھنسے ہوتے ہیں۔ معاشی ترقی کے لیے اس چکر کو توڑنا ضروری ہے۔ لوگوں کو جاگنا چاہیئے اور اپنے ذاتی فائدے کے لیے قدرتی وسائل کو کام میں لانے کے لیے جد وجہد کرنی چاہیئے۔ یعنی پیداوار بڑھانی چاہیئے۔ اور کچھ بچانا چاہیئے اور سرمایہ کاری زیادہ کرنی چاہیئے۔ اگر شروع میں کسی وجہ سے بچت نہیں ہوتی تو ہمیں غیر ملکوں کے وسائل کو استعمال کرکے آغاز کرنا ہوگا۔ بعد میں اگر وہ لوگ عقلمند اور محنتی ہیں تو وہ اپنی

دولت آپ پیدا کرلیں گے۔ اور غیر ملکی امداد سے نجات حاصل کرلیں گے۔

یہ بات صاف ہے کہ سرمایہ کی کمی کو غیر ملکوں سے سرمایہ حاصل کرکے پورا کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی ملک کی شرح بچت کم ہے تو اس کمی کو غیر ملکی بچتوں کے استعمال سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے معاشی ترقی ممکن ہوسکتی ہے۔ غیر ملکی امداد قرضوں کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ جو سود کے ساتھ واپس کی جاتی ہے۔ گرانٹ کی شکل میں امداد کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ تر غیر ملکی امداد قرضوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ غیر ملکی امداد سے ابتدا میں صنعتوں کو قائم کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے ساتھ ٹکنولوجی بھی ملک میں آتی ہے۔ لیکن طویل عرصے کے لیے غیر ملکی امداد کی اعتبار سے نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے۔ اول یہ کہ اس امداد کے ساتھ کچھ شرائط کو جوڑا جاسکتا ہے۔ جیسے امداد کی رقم سے صرف امداد دینے والے ملک سے ہی مال خریدا جائے۔ چاہے وہ سامان گھٹیا ہو۔ اور اس کی قیمت زیادہ ہو۔ دوئم یہ کہ بہت زیادہ سود اور بعد میں قرض کی قسطیں ادا کرنی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہم اس ادائیگی کے لیے اپنی کرنسی کا استعمال نہیں کرسکتے۔ ایسی ادائیگیاں غیر ملکی کرنسی میں کرنی ہوتی ہیں یعنی حاصل شدہ قرض کی رقم میں سے ہی سود اور قسطوں کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح ڈھیر سے ڈھیر سے جو امداد حاصل ہوتی ہے۔ اس میں لگاتار کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور امداد کا بھاری بوجھ باقی رہتا ہے۔ ان باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے غیر ملکی امداد کا استعمال صرف محدود پیمانے پر اور محدود علاقے کے لیے ہونا چاہیئے۔ ملک کو اپنی بچتوں کو بڑھانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ اور خود کفالت کی طرف قدم بقدم آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔

ٹکنولوجی

یہ اچھی طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر سرمایہ، افرادی قوت اور مشینیں بھی موجود ہوں، تب بھی اعلیٰ درجہ کی معاشی ترقی ہونا ضروری نہیں۔ پیداوار کے طریقوں اور مشینوں کے استعمال کرنے کے ڈھنگ کا پیداوار پر کافی اثر پڑتا ہے۔ ان طریقوں کو ٹکنولوجی کہتے ہیں۔

ٹکنولوجی کی ترقی کا انحصار تحقیق اور ماہر افرادی قوت کی فراہمی پر ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہونی چاہیے جن میں ایجاد کرنے اور پیداوار کے نئے طریقوں اور عمل کو ترقی دینے کی صلاحیت ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ سائنسی اور ٹکنیکی تعلیم کو ترقی دی جائے اور نئی ایجادوں اور دریافتوں کے لیے انعامات دیئے جائیں۔

ایک ترقی پذیر ملک ترقی یافتہ ملکوں کی ٹکنولوجی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ غیرملکی امداد اس کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہے بشترکہ کارخانے قائم کرنا ایک دوسرا طریقہ ہوسکتا ہے۔ ایک ہندوستانی فرم اگر کسی غیرملکی فرم کی شرکت میں کوئی پیداواری صنعت یا کارخانہ قایم کرتی ہے تو اُس فرم کو شریک ملک کی ترقی یافتہ ٹکنولوجی حاصل ہو جاتی ہے لیکن آخر میں مقامی تحقیق و ترقی کو ہی فروغ حاصل ہونا چاہیئے۔ اور ہماری اپنی صنعت کو ہی ان چیزوں پر خرچ کے بوجھ کو برداشت کرنا ہوگا۔ ہمارا مقصد خودکفالت ہونا چاہیئے۔

معاشی ترقی میں غیرمعاشی یا اداریاتی عوامل

سیاسی عوامل

سیاسی استحکام کسی ملک کی معاشی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر لوگوں کو

اپنی حکومت پر بھروسہ ہے تو منصوبوں پر بہت اچھی طرح عمل ہوتا ہے۔ اگر ملک میں امن وامان ہے تو لوگ زیادہ بچت کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بچت سے سرمایہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس طرح سیاسی حالات میں استحکام ہونے سے معاشی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

سماجی عوامل

معاشی ترقی سے افرادی رویے اور سیاسی اداروں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اگر موجودہ ادارے اور سماج وقت کی ضرورت کے مطابق خود کو آسانی سے اور جلدی سے بدل لیتے ہیں، تو ترقی کی رفتار تیز کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اس کے برعکس پرانے رسم ورواج اور غیر لچکدار سماجی و تہذیبی قدریں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں سماجی رسم ورواج جیسے شادی، پیدائش، موت وغیرہ پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے محدود وسائل کا غیر پیداواری استعمال، عام طور پر جدید خیال اور کم ذہنی پابندیوں والا سماج بہتر طریقے سے سماجی تبدیلیوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اور بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ مثبت رویہ اپناتا ہے۔

کسی بھی ترقیاتی عمل کی کامیابی کے لیے یقین اور استحکام ضروری ہے۔ غیر یقینی حالت اور غیر محفوظ ہونے کا احساس بچت اور سرمایہ کاری کے لیے نقصان دہ ہے۔ بچت اور سرمایہ کاری کے بغیر کوئی معیشت ترقی نہیں کر سکتی۔ ایک مضبوط حکومت اور صاف ستھرا انتظامیہ ہی یقین اور استحکام کی حالت پیدا کر کے ترقیاتی عمل میں مدد کر سکتے ہیں۔

ایک جدید سماج جو تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ بھی ہو بہت جلد معاشی ترقی کرتا ہے۔ یہ سماج توہم پرستی اور دقیانوسی روایات کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ ایسے افراد پر منحصر ہوتا ہے جو ترقی کرتا ہے اور ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر اس کے خیالات میں لچک ہے اور وہ کسی بھی تبدیلی کو فوراً اپنا لیتا ہے تو ترقی کی رفتار لازمی طور پر تیز ہوتی ہے۔ اور اس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے۔

پانچواں باب

معاشی زندگی پر تقسیم کا اثر

تعارف

ہندوستان نے اپنی ترقی کی جدو جہد بڑے ناموافق حالات میں شروع کی۔ برطانوی حکومت نے اس ملک کی معیشت کو انحصاری بنا دیا تھا۔ برطانوی باشندوں کے بھارت چھوڑ کر چلے جانے کے بعد ایک عرصے تک خود کفالت کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کی وجوہات کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

1. برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کو ہمیشہ اپنی ایک نوآبادی سمجھا۔ انھوں نے ہمارے ملک کے عوام اور یہاں کی دولت دونوں کو لوٹا مثلاً یہ کہ ہمیں ایک زرعی ملک سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا۔ برطانوی صنعت کاروں کا اسی میں فائدہ تھا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کا کچا مال بین الاقوامی منڈیوں میں سستی قیمتوں پر فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اور تیار مال کو آسانی سے ہندوستان میں اونچی قیمتوں پر خوب نفع کے ساتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ اس صورت میں ہم صنعتی ملک کی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کافی مقدار

میں سونا اور سرمایہ ہمارے ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ ہماری ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن گیا۔ اور برطانوی راج ختم ہونے کے بعد بھی جسے آسانی سے ایک لمبے عرصے تک دور نہیں کیا جا سکا۔

2. دوسری جنگ عظیم سے کارخانوں کو کچھ ترقی ملی لیکن زیادہ تر جنگی سامان کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ جنگ سے ہمارا سیدھا تعلق نہیں تھا۔ مگر اپنے حکمرانوں کی خوشنودی اور ان کے عزائم کو پورا کرنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ چونکہ ہم ان کے ماتحت تھے۔ ہم نے جنگ کے لیے فوجیوں کے علاوہ غذائی اشیا' کپڑے اور ہتھیار اور گولا بارود فراہم کیا۔ اس کی وجہ سے جن صنعتوں کو فائدہ پہنچا وہ سوتی کپڑا، پٹ سن سے بنا ہوا سامان، فوجی سازوسامان وغیرہ کے کارخانے تھے مگر ابھی تک مشینیں بنانے، دھات سازی، آمدورفت کا سامان اور کیمیائی چیزیں بنانے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ یہ صنعتیں معاشی ترقی کرنے اور خودکفیل بننے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان صنعتوں میں لگانے کے لیے بہت زیادہ سرمائے اور لمبے عرصے کی ضرورت ہے۔

3. مشکل سے ابھی ہم نے جنگ کے اثرات سے نجات پائی تھی کہ ایک نئی مصیبت یعنی ملک کی تقسیم نے ہماری معیشت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود کفالت اور پُرامن دور کا مقصد مزید التوا میں پڑ گیا۔ اہم مسائل جو تقسیم سے پیدا ہوتے، ان میں ان پناہ گزینوں کو آباد کرنا جو پاکستان سے اپنا گھر بار چھوڑ کر آ گئے تھے۔ پاکستان میں چھوڑی ہوئی ان کی جائدادوں کے دعووں کا فیصلہ کرنا اور ان دونوں ملکوں کے درمیان معاشی اور تجارتی تعلقات کو آخری شکل دینا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ساتھ ہی جنگ سے پیدا شدہ مسائل بھی درپیش تھے۔ جیسے بڑھتی ہوئی قیمتیں، چیزوں کی کمی، پیداوار میں کمی اور بے روزگاری۔

یہ مسئلے تقسیم کی وجہ سے اور بھی الجھ گئے۔ اگلے صفحات میں تقسیم سے پیدا شدہ ان ہی مسائل پر بحث کی جائے گی۔

تقسیم کے معاشی نتائج

ہندوستان کی تقسیم کی دو بہت اہم بنیادیں تھیں۔ اقلیتوں کی آبادی کا تبادلہ اور علاقوں کی تقسیم۔ ان دونوں باتوں کا ہندوستان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ پہلا سوال ان پناہ گزینوں کا تھا جو پاکستان چھوڑ کر ہندوستان آگئے تھے۔ ان لوگوں کے لیے نہ صرف کھانے اور رہنے کا فوراً انتظام کرنا تھا۔ بلکہ انھیں مدد بھی دینی پڑی۔ تاکہ وہ اپنی نئی جگہوں پر کچھ کاروبار شروع کرسکیں۔ دوسرے ہندوستان کو اپنا وہ علاقہ دینا پڑا جو مغربی پنجاب میں گیہوں اور کپاس کی پیداوار کا زرخیز علاقہ تھا۔ مشرقی بنگال (جواب بنگلہ دیش ہے) کا پٹ سن پیدا کرنے والا علاقہ بھی پاکستان میں چلا گیا۔ لیکن مغربی بنگال کی کانوں اور صنعتوں کا علاقہ ہندوستان میں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم سے صنعتی پیداوار اور معدنی پیداوار کے اعتبار سے پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان بہتر رہا۔ لیکن پٹ سن اور کپاس جیسی خام اشیا اور اناج کے معاملہ میں ہندوستان کی حالت کمزور ہوگئی۔ تقسیم کے بعد ملک کا جو معاشی نقشہ بنا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

(ا) صنعتی پیداوار

ہندوستان کی تقسیم کے بعد عرصے تک صنعتی پیداوار کم رہی۔ اس کی خاص وجوہات تھیں، مشینوں اور چیزوں کا نہ ملنا۔ خام مال کی کمی، باربرداری کی مشکلات اور آئے دن مزدوروں کی ہڑتالیں۔ لیکن 1949 - 1948 میں حالات

کچھ بہتر ہوئے۔ فولاد، سیمنٹ اور کوئلے کی صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ لیکن ملک کی دو مشہور صنعتوں یعنی سوتی کپڑا اور پٹ سن کی صنعتوں کی حالت پہلے جیسی ہی خراب رہی۔

2۔ خوراک کی حالت

خوراک کی حالت جو پہلے ہی خراب تھی 47-1946 میں تقسیم کے بعد بے حد خراب ہوگئی۔ 1943 میں راشننگ کا طریقہ جاری کیا گیا جو تقسیم کے بعد ٹوٹ رہا تھا۔ اگست 1947 تک لگ بھگ چودہ کروڑ تیس لاکھ لوگوں پر راشننگ کا نفاذ کیا گیا تھا۔ لیکن ان کے لیے ضروری اناج فراہم نہیں کیا جا سکا چنانچہ راشننگ کو ختم کرنا پڑا۔ اور آنے والے سالوں میں پیداوار بڑھاؤ اسکیم کے تحت اناج کی پیداوار میں اضافہ کر کے اور باہر سے زیادہ اناج حاصل کر کے اس صورت حال کو قدرے بہتر بنایا گیا۔

(3) قیمتیں

قیمتیں لگاتار بڑھتی گئیں۔ تھوک قیمتوں کا اشاریہ (1939=100) بڑھ کر 1947 میں 299 اور 1948 میں 341 ہوگیا۔ اس کی خاص وجہ زر کے پھیلاؤ میں اضافہ اور صنعتی و زرعی پیداوار میں کمی تھی۔ خاص طور پر خوراک کی پیداوار جو 1942-36 کے دوران اوسطاً 4 کروڑ 30 لاکھ ٹن تھی گھٹ کر 1947 میں 4 کروڑ ٹن رہ گئی۔

(4) غیرملکی تجارت

تجارت کی مجموعی صورت حال یہ تھی کہ برآمد میں کمی اور درآمد میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کا فرق یعنی تجارت کا توازن اگرچہ 1947 تک ہمارے موافق تھا۔ لیکن 1946 میں 15 کروڑ روپے سے گھٹ کر تقسیم کے سال میں 5 کروڑ روپے رہ گیا۔ وہ ممالک جہاں سے ہم برآمد کے مقابلہ میں درآمد زیادہ کر رہے تھے ان میں امریکہ، ایران، مصر اور برطانیہ شامل تھے۔

تقسیم ہند کا بنیادی خاکہ

	ہندوستان	پاکستان
آبادی	298 ملین	71 ملین
رقبہ	1045000 مربع میل	365000 مربع میل
زرعی رقبہ	251 ملین	54 ملین ایکڑ
غیر زرعی رقبہ	240 ملین ایکڑ	49 ملین ایکڑ
معدنیات		
کوئلہ	248 لاکھ ٹن	3 لاکھ ٹن
لوہا	23 لاکھ ٹن	
تانبہ	3.3 لاکھ ٹن	—
مینگنیز	3.7 لاکھ ٹن	
پیٹرولیم	66 ملین گیلن	21 ملین گیلن
کرومائیٹ	21 ہزار ٹن	19 ہزار ٹن

جپسم	26 ہزار ٹن	58 ہزار ٹن
صنعتیں		
سوتی کپڑے کے کارخانے	357	15
پٹ سن کے کارخانے	111	
چینی کے کارخانے	176	15
لوہا اور فولاد کے کارخانے	36	
سیمنٹ فیکٹریاں	57	8
کاغذ کے کارخانے	19	
کانچ کی فیکٹریاں	112	5
ریل کی پٹریاں	24,565 میل	6,748 میل
بنکوں کی شاخیں (شیڈولڈ و غیر شیڈولڈ)	4,150	1,201
مرکزی سرمایہ	200.44 کروڑ روپے	35.29 کروڑ روپے

(سی۔ این۔ وکیل کی کتاب Economic Consequences of the Partition', second edition. سے ترتیب دیا گیا)

چھٹا باب

ہندوستان میں منصوبہ بندی کے مقاصد

تعارف

ہندوستان کی آزادی کے وقت یہاں کی معیشت غیر ترقی یافتہ تھی۔ یہاں چند صنعتیں تھیں۔ جیسے سوتی کپڑے کی صنعت، پٹ سن، سیمنٹ، شکر سازی فولاد، کاغذ وغیرہ ان سب کی حالت خراب تھی۔ اور ان کو نئی مشینوں اور آلات کی ضرورت تھی۔ ملک کی زراعت بھی روایتی بنیادوں پر چل رہی تھی۔ ہندوستانی کسان ان پڑھ تھا۔ اور جدید زراعت کے طریقوں سے ناواقف تھا۔ وہ چھوٹے پیمانے پر کام کرتا تھا۔ زیادہ تر ذاتی ضرورت کے لیے اناج اگاتا تھا۔ زراعت کی حالت بہت خراب تھی۔ اور اکثر کسان زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو کچھ وہ اگاتے تھے تقریباً سب کا سب کھا جاتے تھے۔ کچھ بچتا نہیں تھا۔ کیونکہ بچت ہوتی ہی نہیں تھی۔ اس لیے ان کے پاس جدید مشینیں خریدنے کے لیے یہاں تک کہ کھاد اور بیج خریدنے کے لیے بھی پیسہ نہیں رہتا تھا کسان کو نہ صرف بیج خریدنے بلکہ معمولی معمولی ضروریات کے لیے قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ غریب پیدا ہوتا اور غریبی کی حالت ہی میں مرجاتا تھا۔ جو کسان نوکری

کی تلاش میں صنعتی شہروں میں چلے گئے ان کی زندگی بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ آج بھی ہندوستان کے زیادہ تر لوگ غریبی میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ زراعت اور صنعت کے درمیان کوئی تال میل ______ ______ اور توازن نہیں تھا۔ صنعتی ترقی ہوتی تو زراعت کو نقصان پہنچتا چنانچہ زراعت کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ لیکن صنعتوں میں بھی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔ جس طرح کے کارخانے ہمارے ملک میں تھے وہ پیداوار میں اضافہ کے لیے مددگار نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں کپڑا بنانے کی صنعت تھی۔ مگر کپڑا بننے کی مشینیں نہیں تھیں جس سے صنعت بنتی ہے۔ فولاد کے کارخانے تھے لیکن فولاد بنانے والی مشینیں نہیں تھیں اور اسی طرح دوسری صنعتوں کا حال تھا۔ زراعت اور صنعت کے مددگار عوامل جیسے بجلی، سینچائی، ذرائع آمد ورفت اور رسل ورسائل وغیرہ کی بھی حالت خراب تھی۔ مثال کے طور پر پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ تو تھے جو روزگار کی تلاش میں تھے۔ لیکن تکنیکی ماہرین جیسے انجینئر۔ ڈاکٹر اور نیجروں وغیرہ کی کمی تھی۔ جہازرانی، بندرگاہ اور ریلوے کی سہولیات ناکافی تھیں۔ سینچائی کا انتظام زیر کاشت زمین کے بہت تھوڑے حصے کے لیے ہی تھا۔ بجلی کم تھی اس لیے اس کا صنعتوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔

غرض مختصر طور پر آزادی کے وقت یہ ہماری کمزوریاں تھیں۔ جب ہم آزاد ہوئے تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں ان کمزوریوں سے نجات پانے کی تمنا پیدا ہوئی۔ یہ خواہش اس وقت اور بڑھ گئی۔ جب ہمارا ملک ایک خود مختار جمہوریہ بن گیا۔ چنانچہ غریبی کو ختم کرنے کے لیے ہم نے منصوبہ بندی کو اپنایا۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم کچھ عرصے کے بعد پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ معاشی ترقی کر کے ترقی یافتہ ملک بن جائیں۔ ان منصوبوں کے بعد ہماری معاشی حالت نے کیا شکل اختیار کی۔ اس کا ذکر کرنے

سے پہلے ہم بتائیں گے کہ منصوبہ بندی کیا ہے اور اس کا ہندوستان میں مطلب اور مقصد کیا ہے۔

منصوبہ بندی کا مطلب

آج کل منصوبہ بندی کا لفظ بہت عام ہے مثلاً آپ اپنے امتحان کی تیاری کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ آپ کی والدہ گھر کے اخراجات کے لیے منصوبہ بناتی ہیں۔ آپ کے والد ممکن ہے یہ منصوبہ بنا رہے ہوں کہ وہ اپنے وقت کو اپنے کام میں کیسے استعمال کریں ان سب کوششوں میں آپ کا ذہن کچھ عوامل کی طرف جائے گا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر کام کا ایک مقصد ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی منزل ہے۔ جیسے امتحان پاس کرنے کا مقصد، خاندان کے لیے ایک خاص معیار زندگی حاصل کرنے کا مقصد، کوئی کام مکمل کر کے اطمینان حاصل کرنے کا مقصد یا ملازمت میں ترقی کرنے کا مقصد۔ اس کے بعد کچھ وسائل ہیں جیسے وقت، آمدنی یا قابلیت جو محدود ہیں۔ اس لیے ان کو بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ بے کار ضائع نہ ہو جائیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وسائل کو مختلف کاموں میں عقلمندی سے لگایا جانے تاکہ ہمارا مقصد حاصل ہو جاتے۔ مثال کے طور پر آپ کو اپنے محدود وقت کو کھیل، تعلیم، سینما اور سیر و تفریح پر اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ امتحان بھی پاس کرنے کا مقصد پورا ہو جائے اور باقی کام بھی پورے ہو جائیں۔ یہی منصوبہ بندی یا پلاننگ کا مطلب ہے چاہے وہ کسی ایک شخص کے لیے ہو یا کسی ایک قوم کے لیے۔

ملک کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں سب سے پہلے وسائل کو دیکھا جاتا ہے اس کے بعد ان وسائل کو مختلف کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک مشکل

کام ہے۔ اور اس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ ہر ملک میں مختلف قسم کے افرادی اور مادی وسائل ہوتے ہیں۔۔ ان وسائل کا استعمال بھی مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ جیسے زراعت صنعت، سینچائی، طاقت، تعلیم، صحت اور خاندانی فلاح و بہبود ذرائع آمدورفت اور رسل و رسائل وغیرہ میں سرمایہ کاری کرنا۔ وسائل کو اس طرح استعمال کر کے کچھ مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً آمدنی کی شرح میں اضافہ اور فی کس آمدنی (آبادی کے ہر فرد کی آمدنی) میں اضافہ، صنعتی، زراعتی پیداوار میں ترقی، لوگوں کے معیار زندگی میں بہتری۔ اور نئے روزگار فراہم کرنا۔ وغیرہ۔ اگر ملک غریب ہو تو وہ اپنے سارے وسائل کا استعمال غریبی دور کرنے کے لیے کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں منصوبہ بندی کا یہی مقصد ہوگا۔ اس طرح کچھ حد تک جن مقاصد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان سے بھی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ عین ممکن ہے آمدنی بڑھ جائے پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ زیادہ لوگوں کو روزگار مل جائے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے امیر اور زیادہ امیر ہو جائیں اور غریب غریب ہی رہیں بلکہ اور غریب ہو جائیں۔

منصوبہ بندی کے مقاصد

اب ہم ہندوستان کی منصوبہ بندی کے مقاصد پر غور کریں گے۔ آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ منصوبہ بندی کو سمجھنے کے لیے مقاصد کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس وقت ہمارا تعلق اس سے ہے کہ منصوبہ بندی کا عمل کس طرح شروع ہوا۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے ملک میں معاشی منصوبہ بندی کے کیا مقاصد ہیں اور کیا ہم ان مقاصد کو حاصل کر سکیں گے۔ اگلے صفحات میں ہم ان ہی سوالوں کا جواب دیں گے۔

آپ شاید جانتے ہوں کہ ہم نے 51-1950 میں منصوبہ بندی کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ماہرین معاشیات کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن آج بھی کام کر رہا ہے۔ اس کو پلاننگ کمیشن کہتے ہیں۔ اس کمیشن کا خاص کام ہندوستان کے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کمیشن ان وسائل کا اندازہ لگاتا ہے جو آنے والے کچھ سالوں میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ حاصل شدہ وسائل کو مختلف ضروریات کے پورا کرنے کے لیے تقسیم کرتا ہے۔ ان مقاصد اور نشانوں کا خاکہ تیار کرتا ہے جو حاصل کرنے ہیں۔ کیونکہ منصوبہ بندی سے مستقبل کے کاموں کے لیے خاکہ تیار ہوتا ہے۔ اس لیے منصوبہ بندی کمیشن آئندہ کچھ سالوں کے لیے ہی منصوبہ بناتا ہے۔ جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کوئی منصوبہ غیر معین مدت کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ملک میں منصوبہ کی مدت پانچ سال رکھی گئی ہے ہم پنج سالہ منصوبہ بناتے ہیں۔ پانچ سال کے بعد جو ترقی ہوتی ہے اس کا جائزہ لیتے ہیں دوسرا پانچ سالہ منصوبہ پہلے منصوبہ کے دوران ہوئے تجربات کی بنیاد پر اور ساتھ ہی اگلے پانچ سال کی ہماری ضرورتوں اور مقاصد کو دھیان میں رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ 1951-52. میں یہ کام شروع کر کے اب تک ہم نے چار پانچ سالہ منصوبے مکمل کر لیے ہیں۔ یہ منصوبے 1965-66 تک یکے بعد دیگرے چلتے رہے۔ اس کے بعد تین سال کا وقفہ آیا۔ جس کے بعد چوتھا پنج سالہ منصوبہ 1969-70 میں پھر سے شروع کیا گیا۔ اور پانچویں پنج سالہ منصوبہ کا خاکہ بھی تیار کیا گیا جو امید ہے کہ 1974-75 سے لے کر تک چلے گا۔

مختلف پنج سالہ منصوبوں میں ہندوستانی منصوبہ بندی کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ مقاصد پر کم و زیادہ زور دیا جاتا رہا۔ لیکن وسیع تر مقاصد میں شروع سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب ہم ان میں سے کچھ مقاصد کا ذکر کریں گے۔

پہلے پنج سالہ منصوبے سے منصوبہ بندی کا آغاز ہوا۔ اس کا مقصد دوسری جنگ عظیم اور ملک کی تقسیم سے ہماری معیشت کو جو نقصانات ہوتے تھے ان کو دور کرنا تھا خاص طور سے خوراک، خام مال (پٹ سن اور کپاس) کی کمی، بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنا۔ جیسے مسئلوں پر دھیان دیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ آب پاشی اور بجلی پیدا کرنے کے منصوبے بھی بنائے جائیں اور سڑکوں کی تعمیر کی جائے اور ٹوٹے پھوٹے پرانے ریل کے ڈبوں اور انجنوں کو بدلا جائے۔ ہمارے مقاصد میں لوگوں کی آمدنی کو بڑھا کر ان کے معیار زندگی کو اونچا کرنا بھی شامل تھا۔ ساتھ ہی امیر اور غریب کے درمیان جو وسیع فرق موجود ہے اس کو ختم کرنا بھی تھا۔ ان سب مقاصد کو پورا کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے 2,069 کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ بعد میں اس رقم کو بڑھا کر 2,356 کروڑ روپے کر دیا گیا۔ لیکن اس منصوبے کے دوران اصل خرچ صرف 1,960 کروڑ روپے ہوا۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں اور زیادہ اہم مقاصد سامنے تھے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کی کامیابی سے ہمت بڑھ گئی تھی۔ دوسرے منصوبے میں اس کامیابی کو نظر میں رکھا گیا۔ زراعت کے میدان میں خاص طور سے خوراک کی پیداوار میں ہمیں کافی کامیابی ہوئی۔ اس لیے اب صنعتوں کو بہتر کرنے کی ضرورت تھی۔ دوسرے منصوبے کے مندرجہ ذیل خاص مقاصد تھے۔

(a) منصوبے کے دوران قومی آمدنی میں لگ بھگ ایک چوتھائی اضافہ اور رہن سہن کے معیار کو اونچا اٹھانا۔

(b) فولاد، کوئلہ، ایلومینیم، تانبہ اور مشینیں بنانے والی صنعتوں میں تیزی سے ترقی کرنا۔ کیونکہ مستقبل کی ترقی کے لیے ان بنیادی صنعتوں کی ترقی ضروری تھی۔

تقریباً اسّی لاکھ نوکریاں پیدا کر کے روزگار کے مواقع فراہم کرنا۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور روزگار کے درمیان تال میل پیدا کرنا۔

(d) افراد کے معیارِ زندگی کو اونچا اٹھانا اور چند لوگوں کے ہاتھ میں دولت جمع ہونے سے روکنا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے دوسرے منصوبے میں حکومت نے 4,800 کروڑ روپے تجویز کیے تھے لیکن اصل خرچ 4,600 کروڑ روپے ہوا۔

صنعتی پروگرام دوسرے منصوبے کے دوران شروع کیا گیا تھا۔ مگر بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے یہ پروگرام بعد میں بھی جاری رکھا گیا۔ اس لیے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کا خاص مقصد یہ طے پایا کہ آئندہ دس سالوں میں فولاد، کیمیکلس بجلی اور ایندھن، مشینیں اور مشینوں کے پرزوں کی ضرورت کو اپنے ہی ملک میں تیار کی گئی چیزوں سے پورا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس منصوبے کا مقصد اناج اور خام مال جیسے کپاس، پٹ سن، تلہن، وغیرہ کی پیداوار میں خود کفیل بننا بھی تھا۔ جسے دوسرے منصوبے میں نظر انداز کیا گیا تھا۔ دوسرے منصوبے کے مقاصد جیسے روزگار کے مواقع بڑھانا۔ طاقت اور دولت کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکنا۔ اس منصوبے میں بھی شامل کیے گئے۔ اس منصوبے کے تحت قومی آمدنی میں ہر سال پانچ فیصدی سے زیادہ اضافے کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ جبکہ دوسرے منصوبے میں صرف پانچ فیصدی تک سالانہ اضافہ کی توقع تھی۔

حکومت نے کل 7,500 کروڑ روپے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اصل اخراجات 8,577 کروڑ روپے ہوئے۔

چوتھے منصوبے کے دو خاص مقصد تھے:

(i) قومی آمدنی میں 5.5 فیصدی سالانہ کا اضافہ کرنا۔ اس کے ساتھ

پانچ سال کے دوران زرعی پیداوار میں 31 فیصدی اضافہ کرنا تھا۔ پیداوار کی اس سطح تک پہنچنے کے بعد اناج کی پیداوار اتنی ہو جاتی کہ بڑھتی قیمتوں کو روکا جا سکتا۔ اس سے ترقی میں استحکام پیدا ہو جاتا۔

(ii) خودکفیل بننا۔ یعنی غیر ملکی امداد کو دھیرے دھیرے کم کرنا۔ یہ اُمید تھی کہ منصوبے کی مدت کے آخر تک یہ تعداد آدھی رہ جائے گی۔ 1971ء تک امریکہ سے اناج کی درآمد روک دی جائے گی۔ اگر ہندوستان کو باہر سے چیزیں خریدنا بھی پڑیں تو ہمارے پاس باہر کی دنیا میں فروخت کرنے کے لیے چیزیں موجود ہوں گی زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کو اپنی برآمد کو 7 فیصدی کے حساب سے بڑھانا پڑے گا۔

چوتھے منصوبے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ غریبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے گا۔ اور امیروں کی دولت کو محدود کیا جائے گا۔ امیروں کی دولت کو محدود کرنے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی آمدنی اور دولت پر کافی ٹیکس لگائے جائیں لیکن چوتھے منصوبہ میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ٹیکس ہی اس مسئلے کا واحد حل نہیں غریبوں کو روزگار دلانے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ بھی سوچا گیا تھا کہ عام آدمی کی اپنے ذاتی کام کرنے یا چھوٹے موٹے کام کرنے کی نہ صرف ہمت افزائی کی جائے گی بلکہ اس کی ہر ممکن مدد بھی کی جائے گی۔ اس منصوبے سے یہ یقین ہو گیا کہ غریبوں اور کمزور طبقوں (جیسے پسماندہ قبیلے اور ذاتیں۔ بے زمین کسان، تعلیم یافتہ بے روزگار وغیرہ) کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ بشرطیکہ زراعت، صنعت اور ساری معیشت تیزی سے ترقی کرے۔ اس منصوبے سے یہ بھی امید تھی کہ آئندہ دس سالوں میں ہر شخص کی اوسط آمدنی ایک مناسب سطح تک پہنچ جائے گی۔

پانچویں منصوبے کے مقاصد میں تبدیلی کردی گئی تھی۔ پچھلے منصوبوں میں جس مقصد کی طرف بالواسطہ طور سے محض اشارہ کیا گیا تھا۔ اس منصوبے میں اسے مقصد بنا کر شامل کیا گیا۔ وہ مقصد تھا غریبی ختم کرنا۔ پانچویں منصوبے کا ایک اور خاص مقصد خود کفیل بننا تھا۔ ان مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیز رفتار ترقی، آمدنی کی بہتر تقسیم اور موجودہ آمدنی سے زیادہ سے زیادہ بچت حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ اب ہم ان مقاصد کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ کیونکہ یہی مقاصد آئندہ بھی ہمارے پنج سالہ منصوبوں کے بنیادی مقاصد رہیں گے۔

غریبی دور کرنا

اس سلسلے میں سب سے پہلے غریبی کا مطلب سمجھنا ہوگا۔ چوتھے منصوبے میں غریب اُسے تسلیم کیا گیا تھا جس کے کھانے کا خرچ 1960-61 کی قیمتوں کے مطابق 20 روپے ماہوار سے بھی کم ہو۔ پانچویں منصوبے میں 1972-73 کی قیمتوں کے مطابق یہ رقم 40.6 روپے ہوگئی۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی آدمی ایک مہینے میں 40.6 روپے سے بھی کم صرف کرتا ہے تو اُسے غریبی کی سطح سے نیچے رکھا جائے گا اس سلسلے میں دوسرا قدم یہ معلوم کرنا ہے کہ غریب کون لوگ ہیں۔ اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ پنشن پانے والے بوڑھے، بے زمین کسان، اتفاقی مزدور، بے روزگار، پسماندہ قبیلے اور ذاتیں، پسماندہ علاقوں میں رہنے والے وغیرہ غریب لوگوں میں شامل ہیں۔ دراصل ان لوگوں کی غریبی دور کرنے کے لیے قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں غریبوں کی آمدنی کو بڑھانا اور مناسب آمدنی کے روزگار بڑھانا شامل ہیں پانچویں منصوبے میں کم سے کم ضرورتوں کے پروگرام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

جس کے مطابق ہر صوبہ کم آمدنی والے لوگوں اور غریبوں کے لیے اسکول، اسپتال، پینے کے پانی کی سہولتیں وغیرہ فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری کرے گا۔

خود کفالت

اس مقصد کو تیسرے منصوبے سے لگاتار اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ اُمید تھی کہ تیسرے منصوبے میں ہمارا ملک 10 سے 12 سالوں میں سرمایہ کی ضرورت کو خود ہی پورا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ چوتھے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ 74-1973 تک غیر ملکی امداد کو کم کر کے آدھا کر دیا جائے گا۔ اور 81-1980 تک اسے بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ صرف اتنی ہی مالی امداد باقی رکھی جائے گی جو پچھلے قرضوں کی ادائیگی کے لیے کافی ہو۔ خود کفیل ہونے کے لیے چوتھے منصوبے میں وقت کی جو حد مقرر کی گئی تھی وہ پانچویں منصوبے میں مزید پانچ سال اور بڑھا دی گئی اب اُمید یہ ہے کہ 86-1985. تک ہمیں کسی طرح کی غیر ملکی امداد کی ضرورت باقی نہیں رہے گی دوسرے لفظوں میں رعایتی قسم کی امداد صفر کے برابر رہ جائے گی۔ جس پر ہمیں سود کی کم شرح ادا کرنی ہوتی ہے۔ اور قسطوں میں ادا کرنے میں کچھ سالوں کے لیے سود معاف ہوتا ہے۔ خود کفالت سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ کسی غیر ملکی فرم یا بین الاقوامی زر بازار اور غیر ملکی حکومتوں سے بازاری شرح پر قرض نہیں لیے جائیں گے۔

ساتواں باب

ہندوستانی منصوبہ بندی کی کامیابیاں

تعارف

پچھلے صفحات میں ہم نے ان مختلف مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ جن کو مدِنظر رکھ کر پنج سالہ منصوبے تیار کیے گئے تھے جن میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا گیا تھا:

1. زراعتی ترقی
2. صنعتی پھیلاؤ
3. قومی اور فی کس آمدنی میں اضافہ
4. غیر ملکی امداد میں کمی
5. روزگار کے مواقع فراہم کرنا۔
6. غربت دور کرنا

آیئے اب ہم اس بات پر غور کریں کہ ان مقاصد کو پورا کرنے میں ہم نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔

زراعت

مختلف پنج سالہ منصوبوں کے دوران زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ مختلف

فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کی نوعیت الگ الگ رہی ہے۔ مثال کے طور پر 1949-50 اور 1971-72 کے دوران اناج اور تلہن کی پیداوار میں 2.8 فی صدی سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ گنّے کی پیداوار میں 3.7 فی صدی، کپاس میں 3.2 فی صدی اور پٹ سن میں تقریباً 2.0 فی صدی سالانہ اضافہ ہوا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز اضافہ گیہوں کی پیداوار میں ہوا۔ گیہوں کی پیداوار میں 5.4 فی صدی کی سالانہ شرح سے اضافہ ہوا۔ ایک وقت میں یہ اضافہ 8.8 فی صدی سالانہ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ پیداوار 1960-61 اور 1971-72 کے دوران رہی۔ اس زمانے میں ایک خاص قسم کا بیج جسے "میکسکو بیج" کہتے ہیں کسانوں کو بونے کے لیے دیا گیا۔ بعد میں کئی اور طرح کے بیجوں کا پتہ لگا لیا گیا۔ اور انھیں بویا گیا۔ ان بیجوں سے فی ایکڑ پیداوار بہت بڑھ گئی۔ بیجوں کی ایسی قسموں کو زیادہ پیداوار والی قسمیں کہا جاتا ہے۔ ان بیجوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک طریقے سے پانی کا استعمال، کیمیائی کھاد اور کیڑے مار دواؤں کا استعمال بھی کیا گیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1965-66 اور 1974-75 کے درمیانی زمانے میں گیہوں کی پیداوار دُگنی ہو گئی۔ موجودہ گیہوں کی پیداوار 3 کروڑ ٹن ہے۔ نئے قسم کے بیجوں اور کاشت کرنے کے بہتر وسائل اور طریقوں کے استعمال کو "سبز انقلاب" کا نام دیا گیا۔ اسے منصوبہ بندی کا ایک اہم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

صنعت

1960 سے لے کر اب تک کل صنعتی پیداوار دُگنی ہو گئی ہے۔ اس مدت میں بنیادی صنعتیں جیسے کوئلہ، فولاد، بجلی، سیمنٹ، کھاد، اور بڑی اشیائی سرمایہ کی صنعتیں جیسے مشینیں، موٹر گاڑیاں، ریلوے انجن اور ڈبے وغیرہ کی پیداوار

میں 2.7 گنا اضافہ ہوا۔ جو صنعتیں ٹائر اور ٹیوب پٹرولیم کی چیزیں، سوتی دھاگا وغیرہ تیار کررہی تھیں۔ (یعنی وہ سامان جس کی کھپت اسی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کو مزید چیزیں تیار کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے) اور اشیائے صرف جیسے کپڑا، صابن، ماچس، تیل، چائے، کاغذ، موٹر سائیکل، ریفریجریٹر، ٹائپ رائٹر، وغیرہ بنانے والی صنعتوں کی پیداوار میں 1.8 گنا اضافہ ہوا۔ اشیائے صرف کی صنعتوں میں جو کارخانے ریفریجریٹر، ٹائپ رائٹر، موٹر سائیکل، ٹیلیفون وغیرہ بنا رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ ان کی پیداوار 74-1960 کی درمیانی مدت میں لگ بھگ 3.24 گنا بڑھ گئی ہے۔

اس میدان میں ایک اہم کامیابی یہ ہوئی کہ ایسی صنعتوں کو ترقی دی گئی اور پھیلایا گیا جو ترقی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے مشینی اوزار، صنعتی مشینیں ریلوے ویگن، کاریں اور ٹرک، ڈیزل انجن، بجلی کے میٹر، بجلی کے ٹرانسفارمر کھاد اور دوسرا انجینیرنگ کا سامان۔ انجینیرنگ کا سامان غیر ملکوں میں بھی خوب فروخت ہو رہا ہے۔ ان چیزوں کی 68-1967 سے ہم نے بڑے پیمانے پر برآمد شروع کر دی۔ 74-1973 میں ہم نے 180 کروڑ روپے کی برآمد کی۔ آئندہ سالوں میں مزید اضافے کی اُمید ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کامیابی بھی ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ جس کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ پیداوار کے ان شعبوں میں ہم نے تکنیکی قابلیت اور ہنرمندی میں کافی ترقی کی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک نے اپنے ملکوں میں انجینیرنگ اور اشیائے صرف کے کارخانے قایم کرنے کے لیے ہماری مدد طلب کی ہے۔

قومی اور فی کس آمدنی

آمدنی کا بڑا حصہ زراعت اور صنعتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل، بنک کاری اور بیمہ کی سہولتیں بھی اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ اس کل پیداوار کی رقم کو اگر ہم ملک کی ساری آبادی میں تقسیم کر دیں تو فی کس آمدنی معلوم ہو جاتی ہے۔

منصوبہ بندی کے دوران قومی و فی کس آمدنی دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر قومی آمدنی 1960-61 میں (موجودہ قیمتوں کے مطابق) 13,279 کروڑ روپے تھی۔ 1973-74. میں یہ بڑھ کر 49,290 کروڑ روپے ہو گئی اور اسی مدت میں فی کس آمدنی 306 روپے سے بڑھ کر 850 روپے ہو گئی۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ زراعت، جنگلات، مچھلی پالنا، اور کان کنی (جن کو ابتدائی صنعتیں کہا جاتا ہے) میں پیداوار گھٹ رہی ہے۔ لیکن صنعتی پیداوار اور تجارت اور ذرائع آمد و رفت (جن کو بالترتیب دوسرے اور تیسرے درجے کی صنعتیں کہا جاتا ہے) کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جبکہ زراعتی پیداوار کا حصہ گھٹا ہے۔ زراعتی پیداوار 1960-61 میں کل آمدنی کا 52 فی صدی تھی۔ 1972-73 میں کم ہو کر 41 فیصدی رہ گئی۔ اور اب تک جوں کی توں ہے۔ 1960-73. کی مدت میں دوسرے درجے کی صنعتوں کی آمدنی 19 فی صدی سے بڑھ کر 23 فی صدی ہو گئی۔ اور تیسرے درجے کی صنعتوں کی آمدنی 28.8 فی صدی سے بڑھ کر 36 فی صدی ہو گئی۔ یہ تبدیلی معاشی ترقی کی نشاندہی کرتی ہے۔[1]

---

(1) مرکزی محکمہ اعداد و شمار (Central Statistical Organisation.) (باقی اگلے صفحہ پر)

غیر ملکی امداد

غیر ملکی امداد کئی طرح کی ہوتی ہے۔ اس میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ قرضے (جنہیں ادا کرنا پڑتا ہے) اور گرانٹ (جنہیں ادا کرنا نہیں پڑتا) بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ ان قرضوں پر عام طور سے بازاری شرح سود سے کم شرح سود لی جاتی ہے اسے رعایتی امداد بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ قرضوں پر سود دینا ہوتا ہے اور وہ قسطوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس لیے امداد ملتی رہنے پر بھی ان کی سالانہ ادائیگی کرنی پڑتی ہے ان ادائیگیوں کے بعد جو رقم باقی رہتی ہے اسے اصل امداد کہتے ہیں۔

پہلے پنج سالہ منصوبہ تک ہمیں غیر ملکی امداد زیادہ نہیں ملی تھی۔ یہ امداد تقریباً

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا تیار کردہ تخمینہ: یہ تخمینے موجودہ قیمتوں کے مطابق لگائے گئے ہیں یعنی 61-1960 کی پیداوار کو 61-1960 کی قیمتوں سے ضرب دے دی گئی ہے اور 74-1973 کی پیداوار کو 74-1973 کی قیمتوں سے۔ ایسا کرنے سے اس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کہ چاہے پیداوار کافی کم بڑھی ہو یا شاید گھٹ گئی ہو۔ لیکن قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے ایسا ہوا کہ ہماری پیداوار کی قدر بہت بڑھ گئی۔ چونکہ یہ ایک غلط تقابل ہے۔ اس لیے قومی آمدنی کا پتہ لگانے کے لیے ایک اور طریقہ استعمال کرتے ہیں اسے اصل قومی آمدنی Real National Income کہتے ہیں۔ اور اس کا اندازہ ایک سال کی قیمتوں کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مختلف سالوں کی پیداوار کے اعداد کو مستحکم قیمتوں سے ضرب کر کے آمدنی نکالی جاتی ہے۔ اس طرح حساب لگانے سے اصل یا قومی آمدنی 1973-1960 کی درمیانی مدت میں 13.279 کروڑ روپے سے بڑھ کر 19.130 کروڑ روپے ہو گئی۔

318 کروڑ روپے تھی۔ جو دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران بڑھ کر 2,253 کروڑ اور تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران 4,531 کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ اس طرح 74-1973 تک کل غیر ملکی امداد تقریباً 14,200 کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہوگی۔ اصل زر اور سود کی شکل میں ہم نے 74-1973 تک لگ بھگ 4,030 کروڑ روپے کی ادائگی کردی ہے۔ اس طرح ہمیں اب تک تقریباً 10,000 کروڑ روپے خالص یا اصل غیر ملکی امداد مل چکی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے بعد سے غیر ملکی مالی امداد میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ خاص طور سے یہ کمی 69-1968 کے بعد سے ہوئی ہے۔ خام امداد 67-1966 میں 1,131 کروڑ روپے تھی جو 69-1968 میں گھٹ کر 903 کروڑ روپے رہ گئی۔ اور 74-1973 میں مزید کم ہو کر 721 کروڑ روپے رہ گئی۔ جہاں تک خالص غیر ملکی امداد کا تعلق ہے وہ 69-1968 میں 857.0 کروڑ روپے سے گھٹ کر 528 کروڑ روپے رہ گئی۔ [1] اور 74-1973 میں مزید کم ہو کر 209.0 کروڑ روپے رہ گئی۔ ہندوستان میں غیر ملکی وسائل سے خالص آمدنی 72-1971 میں قومی آمدنی کا (موجودہ قیمتوں کے مطابق) 1.5 فی صدی تھی۔ 74-1973 میں گھٹ کر صرف .6 فی صدی رہ گئی [2]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بہت آہستہ آہستہ خود کفالت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں مکمل طور سے خود کفیل ہو جائیں گے۔

روزگار

سرکاری و نجی سیکٹر دونوں میں روزگار فراہم کیے گئے ہیں۔ سرکاری سیکٹر میں

---

(1) یہ اعداد اکنومک سروے 74-1973 صفحہ 107-106 سے لیے گئے ہیں

(2) RBI کی سالانہ رپورٹ صفحہ 14 (جدول 101)

1960-61 میں 71 لاکھ 1972-73 تک 119 لاکھ مزید لوگوں کو روزگار فراہم کیے گئے اور اس دوران نجی سیکٹر میں 50 لاکھ سے 69 لاکھ لوگوں کو روزگار ملے۔ سب سے زیادہ تعداد میں روزگار کے مواقع سرکاری محکموں میں فراہم کیے گئے۔ اس کے بعد آمدورفت اور رسل ورسائل کے شعبوں اور پیداوار کے پرائیویٹ اور سرکاری سیکٹر میں روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔ ان اعداد و شمار میں کھیتی باڑی، گھریلو دستکاریاں اور نجی کاموں میں لگے ہوئے لوگوں کی تعداد شامل نہیں ہے۔ جتنے لوگ ملازمت کی تلاش میں ہیں (پرانے اور نئے نوکری ڈھونڈنے والے دونوں) ان کی تعداد میں جس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزگار کے مواقع میں کوئی اخاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔

غربت

پنج سالہ منصوبوں کے دوران غریبوں کی تکلیفوں کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ گاؤں میں رہنے والے غریبوں کی حالت بہتر ہوئی ہے۔ زمینی اصلاحات سے بے زمین کسانوں کو زمین ملی ہے۔ زرعی خوشحالی سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ ہونا چاہیے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہماری آبادی کا تقریباً 40 فی صدی حصہ اب بھی غریبی کی سطح سے نیچے رہ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک جو اصلاحی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ان سے جزوی طور پر کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی وجوہات اور آئندہ کیا کچھ کرنا ہے اس کے بارے میں اگلے صفحات میں بتایا جائے گا۔

زراعتی ترقی

25 سال کی منصوبہ بند ترقی کے بعد بھی زراعت ہماری معیشت میں غالب حیثیت کی حامل ہے۔ ملک کی ستر فی صدی آبادی کی زندگی کا انحصار براہ راست زراعت پر ہے۔ قومی پیداوار میں 41 فی صدی حصہ زراعت کا ہے یہ اہم حقائق ہیں۔ زراعت کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ بہت سی صنعتوں کا تعلق براہِ راست زراعتی خام مال کی رسد سے ہے جیسے پٹ سن، شکر، چائے، تمباکو، تیل نکالنے والے بیج وغیرہ۔ چھوٹی صنعتوں کی بڑی تعداد بھی زراعتی خام مال کی رسد پر براہ راست منحصر ہے۔ جیسے تیل نکالنا، ہتھ کرگھا، چاول صاف کرنا وغیرہ جب بھی زراعتی پیداوار میں کمی آتی ہے تب ان صنعتوں کی پیداوار میں بھی کمی آجاتی ہے۔ یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جن صنعتوں کا بالواسطہ اور بلاواسطہ زراعتی خام مال کی سپلائی پر انحصار ہے۔ وہ صنعتی سیکٹر کی کل پیداوار کا تقریباً 50 فی صدی حصہ پیدا کرتی ہیں۔ اس براہِ راست اثر کے علاوہ زراعت ایک اور اہم طریقے سے ہندوستانی معیشت کو متاثر کرتی ہے۔ آپ جانتے ہیں مزدور طبقہ سب سے زیادہ خوراک پر خرچ کرتا ہے۔ جب بھی اناج کی پیداوار کم ہوتی ہے اس کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مزدور زیادہ تنخواہوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ جب کارخانے دار اپنے مزدوروں کو زیادہ تنخواہ دیتے ہیں تو چیزوں کی پیداواری لاگت بڑھ جاتی ہے۔ زیادہ لاگت کی وجہ سے وہ مال کو مہنگا کر کے زیادہ قیمت حاصل کرتے ہیں جب چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو مزدور تنخواہوں میں مزید اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر یہ حالت ایک خاص مدت تک رہتی ہے تو تنخواہوں میں اضافے کی وجہ سے قیمتوں میں

اضافہ ہوتا رہتا ہے اور قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے تنخواہوں میں اضافے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے اوپر بیان کردہ وجوہات سے ثابت ہوتا ہے کہ زراعت ہمارے ملک میں تمام معاشی سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔

اگر ہم گذشتہ 25 سالوں کے دوران زراعت کی ترقی کو سلسلے وار دیکھیں تو مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(i) منصوبہ بندی کی پہلی دہائی (1951-61) میں زراعتی پیداوار کی شرح ترقی 3.3% یا 3.4% سالانہ تھی۔ جس میں زراعتی زمین کے رقبہ میں اضافہ تقریباً 1.9% فیصدی اور پیداوار میں 1.3% اضافہ ہوا۔ منصوبہ بندی کی دوسری دہائی میں ترقی کی شرح اوسط تقریباً 2.7% فیصدی تھی۔ اس دوران پیداوار میں 1.9% فیصدی اور زراعتی زمین کے رقبے میں اضافہ 0.6% فیصدی ہوا۔ اس رجحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زراعتی زمین کے رقبہ میں اضافہ کرنے سے زراعتی پیداوار میں اضافہ کی گنجائش بہت محدود ہے۔ جبکہ زراعتی پیداوار (فی ایکڑ پیداوار) میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(ii) ملک کی کل پیداوار میں زراعتی پیداوار کا حصہ گذشتہ سالوں میں کچھ کم رہا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(a) زیادہ پیداواری فصلوں کو بڑھانے کے لیے سینچائی کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ نئے زراعتی علاقے ابھی سینچائی کے تحت نہیں آئے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ زیادہ پیداواری فصلوں کو نئے زراعتی علاقے تک پھیلایا جائے۔

(b) کھاد کا صرف اور پیداوار مقررہ نشانے سے کافی کم ہوتے۔

(c) زیادہ پیداواری فصلوں کا پھیلاؤ صرف چند فصلوں تک محدود ہے۔ دوسری فصلوں کی پیداوار کو بہتر بنانے کے لیے بھی تحقیق ہونی چاہیے۔

(d) تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ اعلیٰ قسموں کی پیداواری فصلوں کے لیے سینچائی، کھاد، بیج وغیرہ کی شکل میں زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو چھوٹے کسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اور اکثریت چھوٹے کسانوں کی ہے، جب تک وہ اس نئی ٹکنولوجی (یعنی پیداوار کے نئے طریقے جیسے سینچائی، نئے بیج، کھاد اور کیڑے مار دواؤں وغیرہ کا استعمال) نہیں اپنالیتے زرعی پیداوار تیزی سے نہیں بڑھے گی۔

(e) گذشتہ 45 سالوں میں ترقیاتی کوششوں کے باوجود قدرت پر ہماری زراعت کا انحصار کم نہیں ہوا۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(1) زیر کاشت وسیع علاقہ ابھی تک سینچائی سے محروم ہے۔ غیر سینچائی والے زراعتی علاقے کی پیداوار کا انحصار موسم پر ہے۔

(2) کھیتی کے نئے طریقوں، خاص طور سے فصلوں کو کیڑوں سے بچانے کے طریقے سے ہمارے کسان ناواقف ہیں۔ موجودہ طریقوں کو استعمال کرنے میں بھی وہ پیچھے ہیں۔

صنعتی ترقی

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں کارخانوں و صنعتوں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کون کون سے طریقے اپنائے تھے۔ صرف 19 ویں صدی کے آخر میں اور اس صدی کے آغاز میں کچھ صنعتوں کو ترقی کرنے کا موقع دیا گیا۔ اس زمانے میں بھی بنیادی اور بڑی اشیائی صنعتوں کو ترقی کرنے نہیں

دی گئی۔ چنانچہ ہندوستان کو مشینوں، اسٹورس اور تکنیکی علم و تربیت کے لیے برطانیہ پر انحصار کرنا پڑا۔ جہاں تک منصوبہ بندی کے دوران صنعتی ترقی کا تعلق ہے مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ درج ذیل باتیں بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(1) اس مدت میں بہت سی بنیادی اور بھاری صنعتیں قایم کی گئیں جیسے لوہا اور فولاد، مشین اور مشینوں کے اوزار، ریلوے انجن، دھات سازی کے کارخانے، بجلی پیدا کرنے والی مشینوں کے کارخانے، کیمیائی کھاد تیار کرنے کے کارخانے وغیرہ۔ پرانی صنعتوں کو وسعت دی گئی۔ یہ وہ صنعتیں ہیں جو کسی ملک کی معیشت کی ترقی کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچہ مہیا کرتی ہیں۔

(2) صنعتی سیکٹر میں جدید ٹکنولوجی کا استعمال کافی ہوا ہے۔

(3) جدید کارخانے قایم کرنے کے لیے تکنیکی علم اور تربیت یافتہ تکنیکی ماہرین کے لیے غیر ملکوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس مدت میں ہم نے خود اپنے ماہرین تیار کر لیے ہیں۔

(4) بنیادی اور کلیدی صنعتوں کی ترقی میں پبلک سیکٹر کی اہمیت بڑھ گئی۔ یہ وہ صنعتیں ہیں جو (a) ترقی کرنے میں کافی وقت لیتی ہیں (b) زیادہ سرمایہ کاری چاہتی ہیں اور (c) جن میں زیادہ خطرات ہیں۔ اس لیے کم از کم ابتدا میں ان صنعتوں میں لوگ نجی سرمایہ نہیں لگاتے۔ معیشت کا یہ بنیادی ڈھانچہ قایم کر کے پبلک سیکٹر نے مستقبل کی ترقی کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔

آٹھواں باب

زر کا کام

ہو سکتا ہے کہ تمہارے والد کسی مقامی کپڑے کے کارخانے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے ہوں اور -/500 روپے ماہانہ تنخواہ لیتے ہوں۔ بحیثیت کلرک ان کا کام مزدوروں کی حاضری کا حساب کتاب رکھنا ہو۔ مزدوروں کی حاضری کا رکارڈ نہ تو تمہاری کسی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے آپ کے والد اس خدمت (یعنی مزدوروں کی حاضری کا رکارڈ رکھنے کا کام) کے تبادلے میں کوئی مفید چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اس جدید معاشی نظام میں اس طرح کے کام (جو بذات خود براہ راست کسی کے لیے فائدہ مند نہیں ہیں) سے آپ کے والد روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ جس سے تمہارا خاندان روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی سینکڑوں چیزیں خریدتا ہے تمہارے خاندان کی روزانہ ضرورتوں کے علاوہ تم اس سے کتابیں کاغذ و پنسل خریدتے ہو۔ اسکول کا لباس بناتے ہو۔ اسکول کی فیس دیتے ہو۔ بسوں میں سفر کرتے ہو وغیرہ لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کا کیا انجام ہوتا اگر زر روزمرہ کے لین دین

کے لیے روپیہ نہ ہوتا۔ (5) موجودہ معاشی نظام کے بجائے ہر گھر یا ہر گاؤں کو اپنی ضرورتوں کی زیادہ تر چیزیں اپنے لیے خود ہی تیار کرنی پڑتیں۔ اس باب میں ہم جدید پیداواری نظام کا مطالعہ کریں گے۔ جس کی بنیاد کام کی تقسیم اور موجودہ پیداواری نظام میں زر کا رول ہے۔

تقسیم کار اور محنت کی پیداواری

جدید معیشت میں پیداوار کا نظام بہت ہی الجھا ہوا ہے۔ آج کوئی بھی شخص یا گھرانہ خود کفیل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ محض اپنی ہی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بجائے ہم میں سے ہر ایک کسی ایک چیز یا چند چیزوں کے بنانے میں یا ایک خاص کام (جو پیداواری عمل میں ایک مرحلہ ہے) کرنے میں ماہر ہے۔ اور وہ اپنی ضرورت کی زیادہ تر چیزیں دوسروں سے تبادلے میں حاصل کرتا ہے۔ اس طرح جدید معیشت میں ہر شخص اپنی روزانہ کی ضرورتوں کے لیے دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ اس قسم کے پیداواری نظام کو تقسیم کار یا "تخصیص کار" کا نام دیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے اس دور میں تخصیص کار کا عمل یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی کی ضرورت بھی کثیر لوگوں کے ذریعے تبادلے میں پوری ہوتی ہے۔

پیداوار کو اس طرح منظم کرنے کے اپنے تکنیکی فائدے ہیں۔ تقسیم کار یا تخصیص کار سے کئی طریقوں سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک ضرب المثل ہے کہ لال بجھکڑ کسی کام میں ماہر نہیں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب ایک شخص اپنے ذہن کو مختلف کاموں میں لگاتا ہے تو ہر کام میں اس کی کارکردگی کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ کسی ایک کام پر پوری توجہ صرف نہیں کر پاتا۔ لیکن اس کے برعکس جب وہ اپنی پوری توجہ ایک کام پر لگا دیتا ہے تو اس کام میں ماہر و کامل

بن جاتا ہے۔ دوسرے جب ایک شخص کو بہت سے مختلف کام کرنے پڑتے ہیں تو قدرتی طور پر ایک کام سے دوسرے کام پر توجہ منتقل کرنے سے اس کا بہت سا وقت برباد ہو جاتا ہے۔ تیسرے کاریگر کو مختلف کام کرنے کے لیے مختلف اوزاروں اور آلات کے سیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اگر اس کے بجائے کہ 100 کاریگر 100 اوزاروں اور آلات کے سیٹوں کے ساتھ 100 کاموں پر لگے ہوں اور ہر ایک کاریگر ایک ہی کام کا ماہر ہو تو اُسے اوزاروں کے ایک ہی سیٹ کی ضرورت ہو گی۔ اس طرح غیر ضروری اوزاروں کی کثرت سے بچا جا سکے گا۔ چوتھے یہ کہ مختلف افراد مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ نتیجے میں جس کام میں وہ ماہر ہیں اور جس میں ان کی دلچسپی ہے اس میں وہ بہتر مظاہرہ کرتے ہیں۔ تخصیص کار سے فرد اور علاقے کی اپنی مخصوص مہارتیں اس کے رجحانات اور وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ پانچویں تخصیص کار سے مشینوں کی ایجاد میں مدد ملتی ہے جس کی وجہ سے مزدوروں کو آسانی بھی ہو جاتی ہے اور مزدوروں کی ضرورت بھی کم سے کم رہ جاتی ہے۔ مختلف کام کرنے کی بجائے جبکہ پوری توجہ ایک ہی کام میں لگی ہو تو کام کرنے کے آسان اور تیز رفتار طریقے دریافت ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔

آخر میں اوپر بیان کیے گئے تمام فائدوں سے وسیع پیمانہ پر پیداوار ہوتی ہے وسیع پیمانے پر پیداوار سے خاص قسم کی مشینیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے مزید مزدوروں میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس طرح محنت کی پیداواری میں کئی گنا اضافہ کر کے تخصیص کار نے وسیع پیمانہ پر پیداوار کو ممکن بنا دیا ہے۔

بارٹر کا تخصیص کار پر اثر

ایک ایسے معاشی نظام کا جس کی بنیاد تقسیم کار اور تبادلے پر ہو کیا انجام ہوگا۔ اگر چیزوں کا لین دین زر کی بجائے بارٹر طریقے سے ہو۔ تبادلے کا ایسا طریقہ جس میں چیزوں کو براہ راست زر کے بجائے چیز سے بدلہ جائے بارٹر کہلاتا ہے۔ ایک لمحہ غور کرنے پر ہی آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ پیداواری نظام میں جس کی بنیاد تقسیم کار پر ہو بارٹر کا طریقہ قابل عمل نہیں۔

اوّل تو آپ کے والد کے کام (کھونچا ضری کا حساب کتاب رکھنا کسی کی طلب کو پورا نہیں کرتا) کے تبادلے میں کوئی قابل استعمال چیز نہیں دے سکتا۔ اس لیے آپ کے خاندان کو یا تو خود اپنی ضرورت کی تمام اشیا کو تیار کرنا ہوگا یا پھر اپنی زائد پیداوار (چیزیں جو آپ کے خاندان نے تیار کی ہیں) دوسروں کی زائد پیداوار اور خدمات سے جن کی آپ کے خاندان کو ضرورت ہے تبادلہ کرنا پڑے گا۔

اگر آپ کا خاندان اپنی ضرورت کی تمام اشیا خود تیار کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، یعنی خود کفیل بننا چاہتا ہے تو تقسیم کار کے متذکرہ بالا فوائد ختم ہو جائیں گے۔ آپ کے خاندان کے کاریگر لال بجھکڑ ہوں گے اور انھیں کسی بھی کام میں مہارت حاصل نہیں ہوگی۔ ان کے ہر کام کی پیداوار بہت کم ہوگی اور ان کا معیار زندگی بھی پست ہوگا۔ اگر آپ کا خاندان تخصیص کار سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک یا دو چیزوں کی پیداوار میں مہارت پیدا کر لیتا ہے اور باقی اشیا کو اپنی زائد پیداوار کے تبادلے میں دوسروں سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فرض کیجیے آپ ایک درزی ہیں اور آپ کے پاس ایک زائد قمیض ہے جس کے تبادلے میں آپ کو جوتوں کی ضرورت ہے۔ لامحالہ آپ کو

ایک ایسا شخص تلاش کرنا پڑے گا جس کے پاس زائد جوتے ہوں اور اس کو قمیض کی بھی ضرورت ہو۔ ایسے آدمی کی تلاش میں آپ کو اپنا قیمتی وقت اور قوت ضائع کرنی پڑے گی۔ اس طرح کی اتفاقی مطابقت شاذونادر ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ دونوں فریق چیزوں کی مقدار اور تبادلے کی شرائط پر متفق بھی ہو جائیں ایک اور دشواری بھی ہے زیادہ تر چیزوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ فرض کیجیے تم ایک کتاب خریدنا چاہتے ہو اور تمھارے پاس صرف ایک گھوڑا بیچنے کے لیے ہے گھوڑے کا ایک ٹکڑا دے کر آپ کتاب نہیں خرید سکتے۔ گھوڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے، اس لیے آپ کتاب نہیں خرید سکیں گے۔

اب ایک لمحے کے لیے ان سینکڑوں ہزاروں چیزوں کے بارے میں سوچو جن کو ہم روزمرّہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ ایسے تبادلے کے تحت ایک ہی چیز کی بہت سی قیمتیں ہوں گی۔ مثلاً 1000 چیزوں میں سے ہر ایک چیز کی قیمتیں 999 ہوں گی۔ اتنی زیادہ قیمتوں کو یاد رکھنا قطعی ناممکن ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ بارٹر کی مشکلات سے تخصیص کار کی حوصلہ شکنی ہو گی اور خود کفالتی کا رجحان بڑھ جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں بارٹر کی وجہ سے سماج تخصیص کار اور وسیع پیمانے کی پیداوار کے فوائد سے محروم ہو جائے گا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

(1) تقسیم کار اور تخصیص کار کے بغیر محنت کی پیداواری کم ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں معیشت کی کل پیداوار بھی گھٹ جائے گی۔

(2) چیزوں کے آسانی سے تبادلے کی ضمانت کے بغیر تقسیم کار اور تخصیص کار ممکن نہیں۔

(3) بارٹر بہت سی ایسی مشکلات پیدا کرتا ہے جن سے چیزوں کے تبادلے میں رکاوٹ
پڑتی ہے۔ اس سے ایک ایسی معیشت میں تقسیم کار اور تخصیصِ کار کی مزید
حوصلہ شکنی ہوتی ہے جس میں تبادلے کا کام بازار کی قوتوں کے عمل اور
ردعمل پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

جدید معیشت میں زر کے کام

تبادلے کا عام ذریعہ

زر چیزوں کے تبادلے کا عام ذریعہ ہے۔ جدید معیشت میں تمام لین دین زر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ ایک ایسے سماج میں جہاں تقسیم کار ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکی ہو، وہاں زر کے کیا کیا فائدے ہیں۔ اگرچہ کسی چیز کے تبادلے میں زر قبول کرنے والے کا مقصد اپنے لیے دوسری قابل استعمال چیزیں حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن ابتداً زر قبول کرنے کا مطلب ہے کہ واحد لین دین (چیز کے بدلے چیز) دہرے لین دین (یعنی پہلے چیز کے بدلے زر اور پھر زر کے بدلے چیز) سے بدل جاتا ہے۔ زر کے ذریعہ چیزوں کے بالواسطہ تبادلے سے بارٹر کی دشواریاں دور ہو گئی ہیں۔ اور تبادلے کی لچک میں اضافہ ہوا ہے۔

قدر کا پیمانہ

تمام چیزوں اور خدمات کی قدر کو زر سے ناپا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں زر ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے مختلف چیزوں کی قدر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ زر کا بحیثیت "قدر کے پیمانے" کے استعمال تبادلے کے ایک ذریعہ کی وجہ سے ہے۔

زر کے تبادلے کی حیثیت سے استعمال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو زر کی قوت خرید کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ خریدار یا بیچنے والے کی حیثیت سے اس کا

بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ نفع بخش سودے بازی کیسے کی جائے۔

ملتوی ادائیگی (deferred payments) کا معیار

'قدر کا پیمانہ' ہونے کی وجہ سے زر مستقبل کی ادائیگیوں کا بھی معیار ہے۔ تمام قرضے، اقرار نامے اور معاہدے زر کے پیمانے سے ہی طے کیے جاتے ہیں مستقبل کی ادائیگی چیزوں کے پیمانے سے بھی طے کی جا سکتی ہے۔ مگر ایسا کرنے میں بہت سی پریشانیاں ہیں۔

زر کی قدر (یعنی زر کی چیزوں اور خدمات کے حاصل کرنے کی قوت خرید) بھی بدلتی رہتی ہے۔ مگر چونکہ زر کو ایک عام ذریعہ تبادلہ تسلیم کر لیا گیا ہے اس لیے مستقبل کے تمام اقرار نامے و معاہدے زر کے ذریعے ہی طے کرنے میں آسانی ہے۔

قدر کا ذخیرہ

زر کا استعمال زر کے ذخیرے کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ بچائی ہوئی چیزوں کو جمع کرنے کے بجائے لوگ عام طور سے اپنی بچتوں کو زر کی شکل میں جمع کرنا پسند کرتے ہیں۔ اکثر چیزیں لمبے عرصے کے لیے نہیں رکھی جا سکتیں۔ دوسرے ادائیگیوں کے لیے عام طور پر چیزیں قبول نہیں کی جاتیں۔ زر حاصل کرنے کے لیے ان کو فروخت کرنا ضروری ہے۔ تیسرے چیزوں کو جمع کرنے میں خرچ ہوتا ہے۔ جبکہ زر کو بآسانی جمع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کو رکھنے کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی اور زر کی موجودگی میں کوئی بھی سودا فوراً طے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک بہت لچکدار شے ہے۔

قیمتوں میں تبدیلیوں کے اثرات

جب قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو زر کی ایک مقررہ مقدار سے ہم کم چیزیں اور خدمات خریدتے ہیں۔ اور جب قیمتیں کم ہو جاتی ہیں تو ہم زر کی اسی مقدار سے زیادہ چیزیں اور خدمات خرید سکتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو زر کی قدر یا قوت خرید چیزوں اور خدمات کو حاصل کرنے کے معاملے میں کم ہو جاتی ہے اگر چیزوں کی قیمتیں گر جائیں تو قوت خرید (یا قدر) میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو ایسی حالت کو افراط زر (Inflation) کہتے ہیں۔ اس کے برعکس حالت کو جس میں قیمتیں گر جاتی ہیں تفریط زر (Deflation) کہتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ افراطِ زر کے دوران زر کی اصل قدر یا قیمت کم ہو جاتی ہے اور تفریط زر کے دوران زر کی اصل قدر بڑھ جاتی ہے۔

افراط زر اور تفریط زر تمام قیمتوں کی مطلق سطح کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ان سے مراد قیمتوں کی وہ تبدیلی نہیں ہے جو چند چیزوں کی قیمتوں میں دوسری چیزوں کی قیمتوں کے مقابلہ میں ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی قیمت کی تبدیلی کو قیمت میں اضافی تبدیلی کہتے ہیں۔ اگر X کی قیمت بڑھتی ہے اور دوسری چیزوں کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تو اس کو قیمت میں اضافی تبدیلی کہیں گے۔ قیمت کی اضافی تبدیلی سے وسائل کو ایک مصرف سے دوسرے مصرف میں بدلنا ممکن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر X کی قیمت Y کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو اس سے X کی پیداوار کا نفع بڑھ جائے گا۔ جب X کی پیداوار میں نفع Y کی پیداوار کے مقابلے میں زیادہ ہوگا تو پیداکار اپنے وسائل کو Y کی پیداوار سے X کی پیداوار میں لگادے گا۔ اس کے برعکس اگر Y کی قیمت X کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو

وسائل کو X کی پیداوار سے Y کی پیداوار میں منتقل کیا جائے گا۔ اس طرح اضافی قیمت کی بدولت بازاری معیشت میں وسائل کا سودمند مصرف ہوتا ہے۔ لیکن افراطِ زر اور تفریطِ زر کی حالت میں قیمتیں ایک ساتھ بڑھتی یا گھٹتی ہیں۔ اس لیے اضافی قیمتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور وسائل بھی منتقل نہیں ہوتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ افراطِ زر اور تفریطِ زر جس سے مراد تمام قیمتوں کی عام سطح قیمت میں تبدیلی ہے اور جو اضافی قیمتوں میں تبدیلی سے مختلف ہے قطعی سودمند نہیں۔

قیمت کی عام سطح میں تبدیلیوں یعنی افراطِ زر اور تفریطِ زر سے سماج کے سبھی طبقے برابر متاثر نہیں ہوتے۔ افراطِ زر اور تفریطِ زر سے آمدنیوں کی ازسرِ نو تقسیم ہوتی ہے جس سے بعض کو نقصان اور بعض کو نفع ہوتا ہے۔ افراطِ زر کے دوران قرضداروں کو فائدہ اور قرض خواہوں کو نقصان ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں -/100 روپے کسی کو قرض دیتا ہوں جس کو یہ رقم ایک سال کے بعد ادا کرنی ہے۔ اگر اسی دوران قیمتیں دوگنی ہو جاتی ہیں تو میں خسارہ میں رہوں گا۔ -/100 روپے جو میں ایک سال کے بعد حاصل کروں گا۔ چیزوں اور سہولتوں کی مقدار میں ان کی قیمت صرف -/50 روپے رہ جائے گی۔ اس معاملے میں قرض لینے والا شخص فائدے میں ہے۔ کیونکہ اُس نے اصل میں کل رقم کی آدھی رقم ادا کی ہے۔ اسی طرح مقررہ آمدنی والے افراد بھی نقصان میں رہتے ہیں۔ کیونکہ افراطِ زر مقررہ نقد آمدنی کی حقیقی قدر کم کر دیتا ہے۔ افراطِ زر نفع خوروں کے لیے بہت مفید ہے۔ افراطِ زر کے زمانے میں پیداواری لاگت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن عام طور سے لاگت میں اضافہ قیمت کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ نتیجہ میں نفع بڑھتا ہی رہتا ہے۔ سٹے باز بھی افراطِ زر کے زمانے میں خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ چیزوں کے ذخیروں کو اونچی قیمتوں پر فروخت کر سکتے ہیں۔ تفریطِ زر کے اثرات افراطِ زر سے بالکل برعکس

ہوتے ہیں۔ تفریطِ زر کا مطلب ہے زر کی قدر میں اضافہ اس سے قرضداروں کو نقصان ہوتا ہے۔ نفع خوروں کو بھی نقصان ہوتا ہے کیونکہ قیمتیں لاگت کے مقابلے میں زیادہ گر جاتی ہیں نتیجہ میں ان کو نقصان ہوتا ہے۔

جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو نفع خوروں کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے افراطِ زر کے دوران جب نفع بڑھتا ہی رہتا ہے تو یہ حالت روزگار اور پیداوار بڑھانے میں ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مزدوروں کو نقصان ہوتا ہے کیونکہ ان کی تنخواہوں کی اصل قدر کم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کو زیادہ روزگار ملتا ہے۔ اور سماج کو زیادہ پیداوار۔ آخر میں سماج کو فایدہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ تو سرمایہ کاری والے منصوبوں کی لاگت بڑھ جائے گی اور تمام پیداواری پروگرام درہم برہم ہو جائیں گے۔ تفریطِ زر جو کہ پیداکاروں کے نفع کو کم کر دیتا ہے، کی وجہ سے بے روزگاری بڑھتی ہے جس کا مطلب ہے کم پیداوار اور پیداواری وسائل کی بربادی۔

ہم نے دیکھا کہ افراطِ زر اور تفریطِ زر کے اثرات تمام لوگوں پر یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ کو فائدہ ہوتا ہے کچھ کو نقصان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قیمتوں میں عدم استحکام سے ترقی پر بھی خراب اثرات پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر افراطِ زر کی حالت میں قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ نتیجہ میں سرمائے کی تشکیل میں ہم حقیقی وسائل کم لگاتے ہیں۔ اس لیے ایک خاص سطح پر قیمتوں کا استحکام ضروری ہے۔ دوسرے باب میں ہم اپنی معیشت میں بنک کے رول کا جائزہ لیں گے۔

نواں باب

ہندوستان میں قرض اور مال کے ادارے

تعارف

پچھلے باب میں ہم نے زر کے بارے میں پڑھا۔ ہم نے اس کی خامیوں کا بھی ذکر کیا اور رائے ظاہر کی کہ اس پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ زر مختلف بنکوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس باب میں ہم بنکوں کے بارے میں بتائیں گے۔ بنکوں کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

1. ریزرو بنک آف انڈیا

زیادہ تر زر یہی بنک فراہم کرتا ہے۔ اور ملک کے تمام بنکنگ اداروں کی نگرانی کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یہ قرض کی فراوانی کو روکتا ہے اور قرضوں کی فراہمی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ زر کا مرکزی ادارہ ہونے کی وجہ سے اس پر زر سے متعلق پالیسی کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ہے تاکہ ترقی اور استحکام کا دوہرا مقصد حاصل ہو سکے۔

2 تجارتی بنک

یہ بنک لوگوں کا پیسہ جمع کرتے ہیں اور ان کو قرض دیتے ہیں۔ ایک طرح

یہ روپیہ پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملک میں کسی ایک شخص کا جمع کیا ہوا روپیہ دوسرے افراد کو قرض دینے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جب لوگوں کو قرض دیا جاتا ہے تو عام طور سے انھیں اپنے بنکوں کے نام چیک کاٹنے کا حق مل جاتا ہے۔ ادائیگی کے لیے شاید ہی کبھی انھیں نقد روپیہ دیا جاتا ہے۔ اُس حد تک بنک قرض پیدا کر کے زر کی فراہمی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

ان میں سے کچھ بنک سرکاری ملکیت اور انتظام میں ہوتے ہیں اور انھیں قومی ملکیت والے بنک nationalised banks کہتے ہیں۔ کچھ دوسرے بنک نجی ملکیت اور انتظام میں ہوتے ہیں۔

3۔ ترقیاتی بنک

یہ خاص قسم کے بنک ہیں۔ یہ صنعتوں کو لمبی مدت کے لیے قرضے دیتے ہیں۔ یہ خاص طور سے ایسے کارخانوں اور کاروباری اداروں کی مالی امداد کے لیے قایم کیے گئے ہیں جنہیں زمین، عمارت، مشین وغیرہ خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کاروباری اداروں کی ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے انہیں ترقیاتی بنک" کہتے ہیں۔ یا "خصوصی مالی ادارے" کہتے ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب سے ان بنکوں کی خصوصیات کا ذکر کریں گے۔

ریزرو بنک آف انڈیا

یہ بنک ہمارے زر اور قرض کے نظام کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ یہ تمام تجارتی بنکوں کی نگرانی کرتا ہے اور ترقیاتی بنکوں کی مدد کرتا ہے جو صنعتوں کی ترقی میں مدد دیتے ہیں۔

ریزرو بنک آف انڈیا حکومت ہند کی ملکیت ہے۔ 1935 میں قایم ہوا تھا اور 1949 میں حکومت نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس بنک کا انتظام کرنے کے لیے ایک مرکزی بورڈ ہے اور بمبئی، کلکتہ، مدراس، اور نئی دہلی میں چار مقامی بورڈ قایم ہیں۔ مرکزی بورڈ کے بیس ممبر ہیں۔ ان میں ایک گورنر ہے اور چار ڈپٹی گورنر۔ باقی پندرہ ممبروں میں ایک حکومتِ ہند کی وزارت خزانہ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ چاروں مقامی بورڈوں کے چار نمائندے اور دس ڈائرکٹر جن کو گورنمنٹ آف انڈیا نامزد کرتی ہے اور جو مختلف کاروباری، تعلیمی اداروں اور مزدوروں وغیرہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔

ریزرو بنک کے کام

ریزرو بنک کے مندرجہ ذیل بنیادی کام ہیں۔

1. نوٹ جاری کرنا

ایک روپے کے نوٹ کو چھوڑ کر جسے حکومت ہند جاری کرتی ہے باقی سب نوٹ ریزرو بنک جاری کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ نوٹ کاغذ پر چھپے ہوتے ہیں اور انھیں قانون کے تحت روپے کے لین دین کے لیے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ نوٹ صرف ردی کاغذ کے ٹکڑے ہو کر رہ جائیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ریزرو بنک جائیں اور نوٹوں کے بدلے سونا یا چاندی جیسی کوئی قیمتی چیز طلب کریں تو آپ کو مایوس ہونا پڑے گا۔ چونکہ ریزرو بنک کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نوٹوں کے بدلے میں برابر کی قیمت کی چیزیں بھی رکھے۔ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ 115 کروڑ روپے کا قیمت کا سونا اور پچاسی کروڑ روپے کے پونڈ اسٹرلنگ اور امریکن ڈالر رکھے۔ اس کی بنیاد پر وہ کتنی ہی قیمت کے نوٹ جاری

کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر 200 کروڑ روپے کا یہ محفوظ ذخیرہ قایم رکھا جائے تو کتنی ہی رقم کے نوٹ جاری کیے جا سکتے ہیں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ریزرو بنک کے پاس 182.0 کروڑ روپے کا سونا اور 167.0 کروڑ روپے کا غیر ملکی اثاثہ (یعنی غیر ملکوں پر ہمارے واجبات جو سونے جیسے ہی ہیں) ہے۔ اس کے بدلے 6,510 کروڑ روپے کے نوٹ چھاپے گئے ہیں۔ ظاہر ہے 6,161 کروڑ روپے کے نوٹوں کے پیچھے کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔ سوائے ساڑھے سات کروڑ روپے کے سکوں اور حکومت کے کاغذی نوٹوں پر وعدہ جس کے تحت وہ 6,153.5 کروڑ روپے کی رقم کی ادائیگی کا وعدہ کرتی ہے۔ اس طرح ریزرو بنک آف انڈیا مندرجہ ذیل اثاثوں کو مدِ نظر رکھ کر نوٹ جاری کرتا ہے۔

(a) سونا

(b) غیر ملکی اثاثہ اور کرنسی

(c) روپے کے سکّے

(d) حکومت کا وعدہ

ان اعداد و شمار سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آپ کے پاس جو نوٹ ہیں اس کے بدلے میں کچھ بھی لینا کیوں مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا تبادلہ غیر قانونی ہے۔

2 حکومت کا بنک

حکومت ہند اپنے تمام نقد روپے پیسے کو ریزرو بنک میں رکھتی ہے اس نقدی کے تحت حکومت چیک دیتی ہے۔ ریاستی حکومتیں بھی ایسا ہی کر سکتی ہیں مصیبت کے موقعوں پر صوبائی سرکاریں 90 دن کے لیے خصوصی قرض لے سکتی ہیں۔ یہ پیشگی لینے کے طریقے اور ذریعے کہلاتے ہیں۔

3. بنکوں کا بنک

بہت سے تجارتی بنک بھی اپنا روپیہ ریزرو بنک میں رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ریزرو بنک کے پاس اپنے کل نقد زر کا ایک حصہ ہی رکھتے ہیں۔ باقی رقم وہ اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ تاکہ جب بھی ان کے گاہک مانگ کریں تو انھیں روپیہ واپس کیا جاسکے۔ تجارتی بنک اپنا نقد روپیہ ختم ہونے پر ریزرو بنک سے قرض بھی لیتے ہیں۔ اس لیے ریزرو بنک کو بنکوں کا بنک بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ سب ہی تجارتی بنک جب ان کی ضروریات زر بیرونی ذرائع سے پوری نہیں ہوتیں تو ریزرو بنک سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس لیے اسے قرض کا آخری ادارہ بھی کہتے ہیں۔

4. قرض فراہم کرنا

ابھی تم پڑھ چکے ہو کہ ریزرو بنک حکومتوں اور تجارتی بنکوں کو قرض فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بالواسطہ قرض بھی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنے وسائل سے دو فنڈ پیدا کیے ہیں جو زرعی اور صنعتی کاموں کے لیے قرض دیتے ہیں ان کو قومی زرعی قرض اور قومی صنعتی قرض کے فنڈ کہتے ہیں۔ پہلا فنڈ 379 کروڑ روپے کا ہے اور دوسرا 265 کروڑ روپے کا۔ ان فنڈس سے براہ راست قرض نہیں دیا جاتا بلکہ سرکاری بنک، ترقیاتی بنک اور ریاستی سرکاروں کی معرفت دیا جاتا ہے۔

5. قرض کنٹرول

ریزرو بنک جہاں ضرورت کے وقت قرض فراہم کرتا ہے وہاں یہ ملک میں زر کی سپلائی زیادہ ہونے پر کنٹرول بھی رکھتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے جب زر زیادہ ہو جاتا ہے اور چیزیں کم ہوتی ہیں تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں زر کی مقدار کو روکنا بہت ضروری ہے۔ ریزرو بنک

یہ کام کئی طرح سے کرتا ہے۔ اس کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ وہ بنکوں، اداروں اور حکومت کو دیے جانے والے قرض پر سود کی شرح بڑھا دیتا ہے۔ اس شرح کو بنک شرح کہتے ہیں۔ آج کل یہ شرح 9 فی صدی ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ریزرو بنک جتنا بھی قرض دیتا ہے وہ سب بنک شرح پر نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ریزرو بنک تجارتی بنکوں کو جو قرض دیتا ہے اُس پر وہ زیادہ سے زیادہ موجودہ شرح کا دوگنا لیتا ہے۔ اس طرح قرض کو زیادہ مہنگا بنا کر یہ زر کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرض کو کم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تجارتی بنکوں کو اپنے نقد روپے کا زیادہ فی صدی حصہ جمع کرانے کے لیے کہا جائے۔ ہندوستان میں جون 1974 میں اسے 3 فی صدی سے بڑھا کر 5 فی صدی کر دیا گیا تھا۔ اور ستمبر 1974 میں اسے مزید بڑھا کر 7 فی صدی کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل نقد روپیہ کی موجودگی تجارتی بنکوں میں کم کر دی گئی۔ قرض کو کنٹرول میں رکھنے کا تیسرا طریقہ کھلا بازاری لین دین ہے۔ جس کا مطلب ہے ریزرو بنک سے ہنڈیوں کو خریدا اور فروخت کیا جائے۔ یہ عمل تجارتی بنکوں کے ذخیرۂ زر میں کمی یا زیادتی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی بنکنگ نظام کے کل قرض کی رقم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرض کو قابو میں رکھنے کا آخری طریقہ یہ ہے کہ کچھ خاص چیزوں کی ضمانت پر قرض نہ دینے کے لیے تجارتی بنکوں کو ہدایات دی جائیں جیسے اگر گیہوں زیادہ قیمت پر فروخت ہو رہا ہے اور آسانی سے حاصل نہیں ہوتا تو ریزرو بنک یہ حکم جاری کر سکتا ہے کہ گیہوں کی ضمانت پر قرض نہ دیا جائے۔ ایسا کرنے سے تاجر بنک سے حاصل کردہ سرمایہ سے گیہوں کا ذخیرہ جمع نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح گیہوں کی بڑھتی ہوئی قیمت رُک جائے گی۔ اس طریقہ کو منتخب قرض کنٹرول کہتے ہیں۔

تجارتی بنک

تجارتی بنک ایک ایسی بنکنگ کمپنی ہوتی ہے جس کا سرمایہ حصص کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کے حصص صرف ایک طرح کے ہو سکتے ہیں یعنی معمولی حصص۔ دوسرے لفظوں میں سب حصہ داروں کو ایک جیسے حقوق اور اختیارات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بنک کا کام کرنے والی کمپنی، کاروباز، پیداوار، تجارت وغیرہ جیسا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی کارخانہ چلانے والی کمپنی یا کاروبار کرنے والی کمپنی کبھی کبھی بنکنگ کاروبار کر سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ عوام کے سرمائے کو یعنی عوامی بچتوں کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں کو ریزرو بنک کی نگرانی میں رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آجکل وہ عوام سے اپنے اداشدہ اصل (paid-up capital) اور ریزرو کے 15 فیصدی سے زیادہ قبول نہیں کر سکتے۔ (۱)

ہندوستان میں کوئی تجارتی بنک اُس وقت تک کام شروع نہیں کر سکتا جب تک وہ ریزرو بنک سے اجازت نہ حاصل کرلے۔ ریزرو بنک کو ان تجارتی بنکوں کی شاخوں اور دفتروں کا معائنہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان میں اکتوبر 1974 تک تقریباً ملکی و غیر ملکی 80 تجارتی بنک تھے، ان میں سے 73 شیڈیولڈ بنک ہیں اور 7 غیر شیڈیولڈ بنک ہیں۔ ان میں سے جولائی 1969 میں چودہ بنک قومیائے گئے (یعنی حکومت نے اپنی ملکیت میں لے لیے ہیں) اسٹیٹ بنک آف انڈیا پہلے ہی سے گورنمنٹ کی ملکیت میں تھا۔ اسٹیٹ بنک اپنے

---

(۱) پہلے یہ حد 25 فیصدی تھی۔

کئی ماتحت بنکوں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

تجارتی بنکوں کا بنیادی کام لوگوں سے روپے قبول کرنا اور اس رقم کو ادھار دینے اور سرمایہ کاری کرنے کے کام میں لگانا ہے۔ ہندوستانی معیشت میں تجارتی بنکوں نے جو رول ادا کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس کے کاموں کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے خاص طور پر ہم مندرجہ ذیل باتوں پر غور کریں گے۔

(1) سب ہی شیڈیولڈ تجارتی بنکوں کا جمع شدہ سرمایہ۔ 1960-61 سے لے کر اب تک چودہ سالوں میں چھ گنا بڑھ گیا ہے اس وقت یہ رقم 10,000 کروڑ روپے سے زیادہ ہے۔

(2) 1973-74. تک یعنی چودہ سالوں میں جو قرضے بنکوں نے دیے ہیں، وہ بھی اسی طرح بڑھے ہیں۔ 1973-74. میں یہ رقم 7,300 کروڑ روپے سے زیادہ تھی۔ اور 1960-61 کی رقم سے تقریباً ساڑھے پانچ گنا زیادہ۔

(3) 1969 اور 1974. کے درمیان بنکوں کی شاخیں تقریباً دُگنی ہوگئیں یعنی 8,262 سے بڑھ کر 16,936. ہوگئیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ قومیانے کے بعد اس تعداد میں زیادہ اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ان نئی شاخوں میں سے زیادہ تر ایسے علاقوں میں کھولی گئیں جہاں پر کسی بھی طرح کی بنکنگ سہولت نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ برائے نام۔ ایک اور خاص بات دیہی علاقوں میں شاخیں قایم ہونا ہے۔ 1969 میں ایسی شاخیں کل شاخوں کا پانچواں حصہ تھیں۔ لیکن 1974. میں یہ بڑھ کر تیسرا حصّہ ہوگئیں۔

(4) تجارتی بنکوں نے تجارت، صنعت اور زراعت کو ترقی دینے اور عام لوگوں کو اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے اور ترقی کرنے کے لیے قرض دینے کے بہت سے نئے طریقے اپنائے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(a) تجارتی بنکوں نے کچھ ریاستوں میں کسانوں کی مدد کے لیے سوسائٹیاں قایم کی ہیں۔ ان سوسائٹیوں کے ممبروں کو بیج و کھاد وغیرہ خریدنے کے لیے قرض دیا جاتا ہے۔ بنک ان کی پیداوار کو فروخت کرنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔

(b) بنکوں نے کسانوں کو قرض دینے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی ہے۔ اگرچہ فی کس قرض کی رقم کم ہوگئی۔ لیکن قرض کی کل رقم میں اضافہ ہوا ہے۔ 1969 کے بعد سے ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جنہیں بنک سے قرض ملا۔ بدقسمتی سے کسانوں سے اس قرض کی وصولیابی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہوسکی۔ اس کی ایک اہم وجہ خشک سالی ہے۔

(c) انتہائی غریب لوگوں کو سود کی جس شرح پر قرض دیے گئے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے لیے گئے سود کی شرح سے کم تھی۔ اس اسکیم کے تحت مارچ 1974 تک 2.5 لاکھ قرضداروں پر تقریباً دس کروڑ روپے کی رقم باقی تھی۔

(d) اب ایک کروڑ روپے سے زیادہ رقم کے قرضے اس وقت تک نہیں دیے جاسکتے جب تک ریزرو بنک سے اجازت نہ حاصل کر لی جائے۔ ایسا اجازتی قرض اسکیم (Credit Authorisation Scheme.) کے تحت کیا گیا ہے۔

(e) شرکت سرٹیفکٹ اسکیم (Participation Certificate Scheme.) کے تحت تجارتی بنک زندگی بیمہ کارپوریشن اور اس جیسے دوسرے اداروں سے مدد لے سکتے ہیں۔ جن بنکوں کو 30 دن سے لے کر 180 دن تک کے لیے کسی بھی رقم کی ضرورت ہے تو وہ 10 فیصدی سالانہ شرح سود پر سرٹیفکٹ جاری کر کے سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ منصوبہ اپریل 1970 میں شروع ہوا تھا۔

پرائیویٹ سیکٹر کے بنکوں کے مقابلے میں بہت اچھی رہی۔

(b) قومیائے بنکوں نے اہم ترجیحی سیکٹروں جیسے زراعت، چھوٹی صنعتیں، چھوٹے دکانداروں، پیشہ ور لوگوں اور بس چلانے والوں کو قرض فراہم کرنے میں خاصی ترقی کی ہے۔ جون 1969 میں قومیانے سے پہلے ان قرضوں کی رقم صرف 235 کروڑ روپے تھی جو ستمبر 1973 کے آخر تک بڑھ کر 885 کروڑ روپے ہو گئی۔ یہ اضافہ چوگنے سے کچھ کم ہے۔

(c) پبلک سیکٹر کے بنکوں نے "گاؤں اپناؤ اسکیم" کے منصوبے کو اپنایا۔ اس کے تحت ایک بنک کچھ گاؤں کو اپنا کر ان کی تمام مالی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اس کا مقصد ہے کہ گاؤں معاشی ترقی کر سکیں۔ جون 1973 کے آخر تک قومی بنکوں نے لگ بھگ 9,600 گاؤں کو اپنایا۔ اسٹیٹ بنک اور اس کے ماتحت بنکوں نے ستمبر 1973 تک 9,100 گاؤں کو اپنایا۔

(d) قومیائے بنک اور اسٹیٹ بنک گروپ ایک نیا پروگرام شروع کر چکے ہیں۔ اس پروگرام کو رہنما بنک اسکیم Lead Bank Scheme کہتے ہیں ملک کے سب ہی 338 ضلعوں کا سروے کیا جا چکا ہے۔ بنک اپنے لیے ضلعوں کا انتخاب خود کریں گے۔ اور ان کے ترقیاتی پروگرام کی رہنمائی کریں گے۔ دوسری باتوں کے علاوہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ ان ضلعوں میں کون کون سی جگہیں ایسی ہیں جہاں بنک کی شاخوں کی فوری ضرورت ہے۔ ایسی جگہوں کا انتخاب کرتے وقت وہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں گے کہ ان جگہوں پر سڑکوں، منڈیوں اور کاروبار وغیرہ کی سہولتیں مہیا ہوں۔

مخصوص مالیاتی ادارے

تجارتی بنک چاہے وہ پرائیویٹ سیکٹر میں ہوں یا پبلک سیکٹر میں، کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ لیکن وہ ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر صنعت کو پلانٹ، مشینیں یا زمین خریدنے اور عمارت بنانے میں جو سرمایہ چاہیے وہ بنک نہیں دے پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے خرچ ہیں جس میں سرمایہ کافی مدت کے لیے پھنسا رہتا ہے۔ چونکہ بنک لوگوں کے جمع سرمایہ کو تھوڑے وقت کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اس رقم کو لمبی مدت کے لیے ادھار نہیں دے سکتے۔ اس لیے صنعتوں کی لمبی مدت کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خاص انتظام کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے مخصوص مالیاتی ادارے ہیں جنھیں میعادی قرض ادارہ کہتے ہیں یا ترقیاتی بنک کہتے ہیں۔ ان بنکوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

(a) یہ ادارے حکومت، تجارتی بنک، زندگی بیمہ کارپوریشن اور اس طرح کے دوسرے اداروں سے حصص اور بونڈ فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔ افراد سرمایہ نہیں دیتے۔

(b) عام طور سے یہ ادارے تجارتی بنکوں کی طرح عوام سے سرمایہ حاصل نہیں کرتے۔

(c) یہ ادارے زمین اور عمارت جیسے قایم اثاثہ کی ضمانت پر قرض دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے لین دین کو "رہن بنکنگ" کہتے ہیں۔

(d) قرض دینے کے علاوہ یہ ادارے صنعتی فرموں کی دوسرے طریقوں سے بھی مدد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو فرم اپنے حصص فروخت کر کے سرمایہ

قومیائے بنک

19 جولائی 1969 کو حکومت نے چودہ تجارتی بنکوں کو اپنے ہاتھ میں۔ لے لیا تھا۔ یہ سب سے بڑے بنک تھے اور لوگوں کی نجی ملکیت میں تھے۔ اس تاریخ سے قبل صرف ایک تجارتی بنک اسٹیٹ بنک آف انڈیا اور اس کے سات سبسیڈیریز (subsidiaries)[1] ماتحت بنک حکومت کی ملکیت میں تھے۔ یہ چودہ بنک قومیائے ہوئے بنک کہلاتے ہیں۔ اسٹیٹ بنک اور اس کے ماتحت بنک سب پبلک سیکٹر بنک کہلاتے ہیں۔

پرائیویٹ تجارتی بنکوں میں بہت بڑی برائی یہ تھی کہ وہ اپنے ہی واقف کاروں کو روپیہ قرض دیتے تھے۔ جو کہ عام طور سے بڑے تاجر، صنعت کار اور سرمایہ دار تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چھوٹے اور کمزور طبقے کے لوگ (جیسے رکشا چلانے والے، ٹیکسی ڈرائیور، قلی، کاریگر، بڑھئی وغیرہ) بنکوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے۔ یہ بنک کسانوں کو بھی قرض نہیں دیا کرتے تھے۔ اس طرح وہ ملک کی معیشت کی اہم ضرورت کی طرف توجہ کرنے کی فکر نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ ایک برآمد کرنے والے کے مقابلے میں سٹے باز کو، چھوٹے صنعت کار کے مقابلے میں بڑے صنعت کار کو ٹریکٹر بنانے والے کے مقابلے میں کار بنانے والے کو قرض فراہم کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس طرح کی جانب داری اس لیے بھی

---

(1) subsidiary ایسی کمپنی کو کہتے ہیں جس میں زیادہ تر حصص یا ڈائرکٹر یا رائے دہندہ کسی دوسری کمپنی کے ہوتے ہیں اس کمپنی کو ہولڈنگ کمپنی یا اجارہ دار کمپنی کہتے ہیں۔ اسٹیٹ بنک کے ماتحت بنکوں کا درجہ اجارہ کمپنی یا ہولڈنگ کمپنی کا ہے۔

ممکن تھی۔ کیونکہ کار بنانے والے کارخانے کا ڈائرکٹر بنک کا ڈائرکٹر بھی ہوتا تھا۔ آپ خود یہ تسلیم کریں گے کہ اس قسم کا قرض دینے کا طریقہ ملک کے مفاد میں نہیں تھا۔ وہ لوگ اور علاقے جن کو روپیہ و سرمایہ کی فوری ضرورت ہوتی تھی، ان کو روپیہ نہیں ملتا تھا۔ سرمایہ داروں کو اور بھی زیادہ سرمایہ مل جاتا تھا۔ اور وہ اس سرمایہ کو نفع حاصل کرنے، جمع خوری، سٹے بازی اور عیش و عشرت کا سامان تیار کرنے میں خرچ کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ضرورت مند علاقوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے حکومت نے چودہ بڑے پرائیویٹ تجارتی بنکوں کو قومیانے کا فیصلہ کیا۔ ان میں چند خاص بنک یہ ہیں۔ پنجاب نیشنل بنک، بنک آف بڑودہ، یونائیٹڈ کمرشل بنک، بنک آف انڈیا، سینٹرل بنک آف انڈیا وغیرہ۔

قومیائے بنکوں کی کارکردگی

قومیائے بنکوں کے سامنے جو مقصد تھے، ان کی تکمیل کے لیے ان بنکوں نے کافی کوشش کی ہے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنے آپ کو سماج کے تمام طبقوں امیر اور غریب کے لیے مفید ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے خاص طور سے زراعت، برآمد، چھوٹی صنعت اور تاجروں کی مدد کی ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور سے ذکر کرنا ضروری ہے۔

(a) 1969-73 کی مدت میں چودہ قومیائے بنکوں کے ذریعہ دیئے گئے کل قرض پہلے کے مقابلے میں دُگنے ہو گئے ہیں۔ اس مدت میں اسٹیٹ بنک اور اس کے ماتحت بنکوں کے قرض میں 50 فیصدی اضافہ ہوا۔ قومیائے بنکوں کی ترقی اسٹیٹ بنک اور اس کے ماتحت بنکوں اور

پرائیویٹ سیکٹر کے بنکوں کے مقابلے میں بہت اچھی رہی۔

(b) قومیائے بنکوں نے اہم ترجیحی سیکٹروں جیسے زراعت، چھوٹی صنعتیں، چھوٹے دکانداروں، پیشہ ور لوگوں اور بس چلانے والوں کو قرض فراہم کرنے میں خاصی ترقی کی ہے۔ جون 1969 میں قومیانے سے پہلے ان قرضوں کی رقم صرف 235 کروڑ روپے تھی جو ستمبر 1973 کے آخر تک بڑھ کر 885 کروڑ روپے ہو گئی۔ یہ اضافہ چوگنے سے کچھ کم ہے۔

(c) پبلک سیکٹر کے بنکوں نے "گاؤں اپناؤ اسکیم" کے منصوبے کو اپنایا۔ اس کے تحت ایک بنک کچھ گاؤں کو اپنا کر ان کی تمام مالی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اس کا مقصد ہے کہ گاؤں معاشی ترقی کر سکیں۔ جون 1973 کے آخر تک قومی بنکوں نے لگ بھگ 9,600 گاؤں کو اپنایا۔ اسٹیٹ بنک اور اس کے ماتحت بنکوں نے ستمبر 1973 تک 9,100 گاؤں کو اپنایا۔

(d) قومیائے بنک اور اسٹیٹ بنک گروپ ایک نیا پروگرام شروع کر چکے ہیں۔ اس پروگرام کو رہنما بنک اسکیم Lead Bank Scheme کہتے ہیں ملک کے سب ہی 338 ضلعوں کا سروے کیا جا چکا ہے۔ بنک اپنے لیے ضلعوں کا انتخاب خود کریں گے۔ اور ان کے ترقیاتی پروگرام کی رہنمائی کریں گے۔ دوسری باتوں کے علاوہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ ان ضلعوں میں کون کون سی جگہیں ایسی ہیں جہاں بنک کی شاخوں کی فوری ضرورت ہے۔ ایسی جگہوں کا انتخاب کرتے وقت وہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں گے کہ ان جگہوں پر سڑکوں، منڈیوں اور کاروبار وغیرہ کی سہولتیں مہیا ہوں۔

مخصوص مالیاتی ادارے

تجارتی بنک چاہے وہ پرائیویٹ سیکٹر میں ہوں یا پبلک سیکٹر میں کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ لیکن وہ ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر صنعت کو پلانٹ، مشینیں یا زمین خریدنے اور عمارت بنانے میں جو سرمایہ چاہیے وہ بنک نہیں دے پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے خرچ ہیں جس میں سرمایہ کافی مدت کے لیے پھنسا رہتا ہے۔ چونکہ بنک لوگوں کے جمع سرمایہ کو تھوڑے وقت کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اس رقم کو لمبی مدت کے لیے ادھار نہیں دے سکتے۔ اس لیے صنعتوں کی لمبی مدت کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خاص انتظام کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے مخصوص مالیاتی ادارے ہیں جنھیں میعادی قرض ادارہ کہتے ہیں۔ یا ترقیاتی بنک کہتے ہیں۔ ان بنکوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

(a) یہ ادارے حکومت، تجارتی بنک، زندگی بیمہ کارپوریشن اور اس طرح کے دوسرے اداروں سے حصص اور بونڈ فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔ افراد سرمایہ نہیں دیتے۔

(b) عام طور سے یہ ادارے تجارتی بنکوں کی طرح عوام سے سرمایہ حاصل نہیں کرتے۔

(c) یہ ادارے زمین اور عمارت جیسے قایم اثاثہ کی ضمانت پر قرض دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے لین دین کو "رہن بنکنگ" کہتے ہیں۔

(d) قرض دینے کے علاوہ یہ ادارے صنعتی فرموں کی دوسرے طریقوں سے بھی مدد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو فرم اپنے حصص فروخت کر کے سرمایہ

حاصل کرنا چاہتی ہے، یہ انھیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ عوام میں اس رقم کے حصص ضرور فروخت کر دیں گے۔ اور جو حصص نہیں فروخت ہوں گے وہ یہ خود خرید لیں گے۔ اس کو underwriting یعنی تحریری ذمہ داری کہتے ہیں۔ اس سے کمپنیوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں سرمایہ ضرور مل جائے گا۔ چاہے ان کے حصص فروخت ہوں یا نہ ہوں۔ اس طرح یہ کوئی فرم قایم کرنے سے پہلے اس کے سائز، جگہ اور مصنوعات کی نوعیت کے بارے میں صلاح مشورہ دیتے ہیں اسے تکنیکی صلاح کہتے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ اب تک ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کون کون سے ادارے قایم ہوئے ہیں؟ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے مندرجہ ذیل ادارے قایم کیے گئے ہیں۔

1. صنعتی ترقیاتی بنک (Industrial Development Bank of India.)

یہ بنک سنہ 1964 میں قایم ہوا تھا۔ اور یہ مخصوص اداروں میں سب سے اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کے دو اہم کام یہ ہیں۔ دوبارہ سرمایہ لگانا یعنی ان بنکوں اور اداروں کو قرض دینا جنھوں نے افراد اور فرموں کو قرض دیا ہے۔ دوسرا کام تکنیکی صلاح مشورہ دینا ہے۔ ابھی حال ہی میں اس بنک نے ایک اور کام کی ذمہ داری لی ہے وہ ہے ملک کے پسماندہ علاقوں کو خاص قسم کی مدد دینا۔ یہ بنک جو IDBI, (انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک آف انڈیا) کے نام سے مشہور ہے ریزرو بنک آف انڈیا کی ملکیت ہے۔ 1973-74 میں اس بنک کی قرض کی رقم 184 کروڑ روپیہ سالانہ ہو گئی ہے۔

2۔ صنعتی مالیاتی کارپوریشن (Industrial Finance Corporation)

یہ سب سے پہلا ادارہ ہے جو 1948 میں قایم ہوا۔ یہ بڑے اور درمیانے درجے کی صنعتوں کو 25 سال کی مدت کے لیے قرض دیتا ہے۔ یہ کارپوریشن ان قرضوں کی ضمانت دیتی ہے۔ جو صنعتیں اور فرمیں دوسرے ذرائع سے حاصل کرتی ہیں۔ اس وقت یہ 44 کروڑ روپے سالانہ کی مدد دیتی ہے۔ حکومت اور دوسرے ادارے اس کے حصص کے مالک ہیں۔

3۔ صنعتی قرض وسرمایہ کاری کارپوریشن

(Industrial Credit and Investment Corporation.)

اسے 1955 میں پرائیویٹ صنعتوں کے لیے سرمایہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ اس کا خاص کام سرمایہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لینا اور غیر ملکی کرنسیوں (ڈالر، پونڈ، اسٹرلنگ، مارک، فرینک وغیرہ) میں قرض کا انتظام کرنا ہے۔ 74-1973 میں اسے 61 کروڑ روپے کی سالانہ مدد دینے کی اجازت ملی ہے۔

4۔ ریاستی مالیاتی کارپوریشن (State Financial Corporations.)

یہ 1951 کے بعد مختلف ریاستوں میں الگ الگ تاریخوں میں قایم کی گئیں۔ جون 1974 کے آخر تک ان کی تعداد اٹھارہ تھی۔ ان کا خاص کام چھوٹی صنعتوں کو قرض فراہم کرنا اور ضمانت دینا ہے۔ 74-1973 میں ان سب نے جو مدد دی تھی وہ 106 کروڑ روپے کی تھی۔ یہ کارپوریشن، ریزرو بنک، صنعتی ترقیاتی بنک اور

ریاستی حکومتوں سے قرض لے سکتی ہے۔ معینہ مدت کے لیے لوگوں کا روپیہ جمع رکھ سکتی ہے۔

۹۔ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا (Unit Trust of India.)

اگرچہ یہ ادارہ خاص طور سے صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لیے قایم نہیں کیا گیا بلکہ یہ بالواسطہ ایسا کرتا ہے۔ یہ اپنے حصص جسے یونٹ کہتے ہیں، چھوٹی چھوٹی بچت کرنے والوں کو فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ سرمایہ کو کمپنیوں کے حصص اور ڈبینچر debentures خرید نے میں لگا دیتا ہے۔ اس طرح کمپنیوں کو UTI سے بالواسطہ سرمایہ مل جاتا ہے۔ اس وجہ سے چھوٹی چھوٹی بچت والے ان کمپنیوں کے حصے دار بن جاتے ہیں جن کے حصص یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا خریدتا ہے لیکن بالواسطہ ایسا ہوتا ہے۔ 1973-74 میں اس ادارے کے ذریعہ صنعتوں کو جو مدد دی گئی وہ 8 کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔

کوآپریٹو بنک

کوآپریٹو بنک باہمی امداد کے اصول پر قایم کیے گئے ہیں۔ یہ ایک مخصوص ڈھانچے میں رہ کر اپنا کام کرتے ہیں۔ سب سے نچلی سطح پر ابتدائی قرض سوسائٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک یا چند گاؤں کے لوگ ان سوسائٹیوں کے ممبر ہوتے ہیں۔ ممبر اس کے حصص خریدتے ہیں۔ اور حصص کا سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے عوض یہ سوسائٹیاں ممبروں کو قرض دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ممبروں کی رقم جمع کی شکل میں حاصل کرتی ہیں۔ اور اپنے سے بڑے اداروں سے ادھار لیتی ہیں۔

1972-73 میں سارے ملک میں تقریباً 1,58,000 سوسائٹیاں تھیں لگ بھگ

[illegible] کروڑ آدمی اس کے ممبر ہیں ان میں سے زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ ان سوسائٹیوں کے پاس حصص کو فروخت کرکے حاصل شدہ سرمایہ 237 کروڑ روپے اور 77 کروڑ روپے جمع کی صورت میں ہے۔ اس سرمایہ کی بنیاد پر ان سوسائٹیوں نے تقریباً 908 کروڑ روپے کے قرض دیے ہیں۔ ابتدائی سوسائٹیوں کے اوپر سنٹرل کوآپریٹو بینک ہوتے ہیں۔ اندازاً ہر ضلع میں ایک سنٹرل کوآپریٹو بنک ہے۔ ضلع کی سب ابتدائی قرض سوسائٹیاں کو اس بنک کا ممبر بننا ضروری ہے۔ یہ بنک اپنے اوپر کے اداروں سے قرض لیتے ہیں 1972-73 میں ایسے بنکوں کی تعداد 344 تھی اور ان کا حصص سرمایہ 245 کروڑ روپے و جمع رقم 645 کروڑ روپے تھی۔ انھوں نے ریزرو بنک سے بھی 364 کروڑ روپے کا قرض لے رکھا تھا۔ 1972-73 میں انھوں نے 961 کروڑ روپے کے قرض دیے۔

کوآپریٹو بنکوں کے نظام میں سب سے اوپر ریاستی کوآپریٹو بنک ("state cooperative bank") ہوتے ہیں۔ تقریباً ہر ریاست میں ایسا ایک بنک ہے۔ ستمبر 1974 تک ایسے کل بنکوں کی تعداد 25 تھی۔ ان اعلیٰ اداروں کے ممبر سنٹرل بنک بھی ہوتے ہیں۔ یہ ریزرو بنک سے قرض بھی لے سکتے ہیں اور کچھ خاص کاموں جیسے کوئیں کھودنا، زمین برابر کرنا، ڈیری اور پالٹری فارم قائم کرنا اور ٹریکٹر خریدنے یا پمپ وغیرہ لگانے کے لیے دیے گئے قرض کے بدلے سرکاری ادارے جیسے زراعتی باز مالیاتی کارپوریشن ("Agricultural Refinance Corporation") سے دوبارہ سرمایہ[1] حاصل کرسکتے ہیں۔

---

(1) باز سرمایہ فراہمی Refinance کا مطلب ہے دوسرے درجہ کی مالیاتی مدد یعنی قرض دینے کی وجہ سے وسائل میں جو کمی آجائے اس کو پورا کرنے کے لیے مزید رقم حاصل کرنا۔ یا قرض کے بدلے قرض حاصل کرنا۔

1972-73 میں 23 ریاستی کوآپریٹو بنکوں کا کل سرمایہ 142 کروڑ روپے اور جمع اصل 406 کروڑ تھا۔ اسی سال انھوں نے 1087 کروڑ روپے کی رقم بطور قرض دی ہے۔

ایک خاص قسم کے کوآپریٹو بنک بھی ہوتے ہیں جنھیں زمین ترقیاتی بنک (land development banks) کہتے ہیں۔ یہ زرعی کاموں میں مدد دیتے ہیں اور پیداواری مقاصد کے لیے قرض دیتے ہیں۔ ان کے بدلے میں یہ بنک زراعتی باز مالیاتی کارپوریشن (Agri cultural Refinance Corporation) سے اتنی ہی رقم اُدھار لے سکتے ہیں۔ یہ بنک ڈبنچرس (debentures.) جاری کرکے بھی سرمایہ جمع کرسکتے ہیں۔ ڈبنچرس ایسے سرٹیفکٹ ہوتے ہیں جن میں حاصل شدہ قرض کو تسلیم کیا گیا ہو۔ یہ عوام سے حاصل کیے گئے قرض کے بدلے دیے جاتے ہیں۔ اگر دیہی لوگ ان کو نہیں خریدتے تو زندگی بیمہ کارپوریشن، اسٹیٹ بنک، تجارتی بنک، ریاستی حکومتیں اور مرکزی حکومت انھیں خرید کر مدد دے سکتی ہے۔

1972-73 میں اس طرح کے 19 ریاستی زمینی ترقیاتی بنک تھے جن کا سرمایہ 97 کروڑ روپے تھا۔ اور جنھوں نے 738 کے ڈبنچرس جاری کیے تھے۔
1972-73 میں 146 کروڑ روپے کی رقم بطور قرض دی تھی۔

زرعی باز سرمایہ فراہمی کارپوریشن (Agricultural Refinance Corporation) 1963 میں اس لیے قایم کی گئی تھی کہ یہ ان تمام اداروں کو سرمایہ فراہم کرے گی جو زراعتی مقصد کے لیے قرض دیتے ہیں۔ اس کارپوریشن سے ریاستی کوآپریٹو بنک، زمین ترقیاتی بنک اور تجارتی بنک دوسرے درجے کی مالیاتی امداد حاصل کرسکتے ہیں۔

جون 1974 تک اس کارپوریشن نے زراعتی مشینیں خریدنے، زمین و ڈیری کی ترقی وغیرہ سے متعلق 597 اسکیموں کی منظوری دے دی تھی۔ سب سے زیادہ رقم زمینی ترقیاتی بنکوں (land development banks) کے ذریعہ دی گئی۔ اس اسکیم سے سب سے زیادہ فائدہ آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا، پانڈیچری۔ اور تامل ناڈ کی ریاستوں کو ہوا۔

ساہوکار (Indigenous Bankers)

ہندوستان میں دیہی علاقوں میں ساہوکاروں کا ایک خاص مقام ہے۔ دراصل یہ لوگ گاؤں میں رہنے والے امیر خاندان ہیں جو کسانوں کو قرض دیتے ہیں۔ یہ تجارتی بنکوں کی طرح لوگوں کا روپیہ جمع رکھنے کے لیے حاصل نہیں کرتے۔ ہاں یہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کا روپیہ جمع کرتے ہیں۔ اس پر اچھا سود بھی دیتے ہیں لیکن وہ قرض دی ہوئی رقم پر بہت اونچی شرح پر سود وصول کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا کاروبار بہت نفع بخش ہے۔ ان میں سے زیادہ تر قرض دینے کے علاوہ کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف ساہوکار ہیں اور روپے کو سود پر دینے کا کام کرتے ہیں۔ اپنے روایتی طریقے پر یہ کسانوں کو قرض دیتے ہیں۔ فصل کی کٹائی کے بعد یہ پوری فصل کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس کو یا تو کمیشن پر فروخت کر دیتے ہیں یا خود خرید لیتے ہیں۔ اس طرح وہ کسانوں سے مزید نفع حاصل کرتے ہیں۔

عام طور سے ساہوکار کچھ ضمانت لے کر قرض دیتے ہیں۔ یہ ضمانت سونا، زیور یا زمین کی شکل میں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہنڈی یا پرونوٹ پر بھی قرض دیتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف شہری علاقوں تک محدود ہے۔

اگرچہ ساہوکاروں نے کسانوں کی ضرورتوں کو کسی حد تک پورا کیا ہے لیکن بعض باتوں کی وجہ سے ان پر تنقید کی گئی ہے مثال کے طور پر انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ جاہل کسان قرض کی رقم کیسے خرچ کرتے ہیں؟ وہ صرف زیادہ سود سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ رقم کہیں شادی و موت اور سماجی رسم و رواج کو پورا کرنے کے لیے تو خرچ نہیں کر دی جاتی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حسابات کے بہی کھاتوں میں کسانوں پر واجب رقم چالاکی اور مکاری سے گڑبڑ کر دی جاتی ہے اور جاہل کسانوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چل پاتا۔ حقیقت میں قرض کھاتوں میں اس کے نام رقم لکھی رہتی ہے۔ کسان مزید قرض نہیں لیتا پھر بھی اس کے نام اصل زر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اس کی ادائیگی اکثر درج نہیں کی جاتی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کسان قرضدار پیدا ہوتا ہے اور قرضدار ہی مر جاتا ہے۔ اگرچہ کوآپریٹو سوسائٹیاں ساہوکاروں کی جگہ لے رہی ہیں۔ مگر پھر بھی مکمل تبدیلی کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ ان پر قابو رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ان کا عمل دخل غیر منظم طور پر ہندوستان کے بازاری سرمایہ پر ہے ان پر قابو حاصل کرنے کے لیے تجارتی بنک یا کوآپریٹو بنکوں کی تیز رفتار ترقی اور سہولیات میں اضافہ ہونا چاہیے۔ ریزرو بنک ان ساہوکاروں پر قابو رکھنے میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر کنٹرول یا قابو رکھنے کے لیے ایسے مسابقتی اداروں کو فروغ دیا جائے جو ان کی جگہ لے لیں۔

دسواں باب

ہندوستانی غربت کا چیلنج

تعارف

ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے پانچویں پنج سالہ منصوبہ کا اہم مقصد غربت دور کرنا ہے۔ اس سے پہلے منصوبوں میں بھی غربت کو دور کرنے کا بالواسطہ ذکر موجود ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ غریبی دور کرنے میں کچھ کامیابی ہوئی ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے مزید کوششیں جاری ہیں۔

غربت کا مطلب

غریبی کو دو طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ غربت بتانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ "میں اپنے پڑوسی کے مقابلے میں غریب ہوں"۔ دوسرا طریقہ ہے "میں اتنا غریب ہوں کہ ایک دن میں مشکل سے ایک بار کھانا کھاتا ہوں"۔ غربت کی وضاحت کا پہلا طریقہ اضافی ('relative') ہے۔ اس کے مطابق ایک خاصا امیر آدمی بھی اپنے زیادہ امیر پڑوسی کے مقابلے میں خود کو غریب کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح کی غربت امیر ملکوں میں بھی ہے۔ ہندوستانی غربت کو اس

طریقے سے سمجھنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ غربت کو سمجھنے کا دوسرا طریقہ غربت کا مکمل مفہوم بیان کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس میں کم سے کم ضروریات زندگی پر زور دیا گیا ہے کہ جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو شخص یا خاندان ان کم سے کم ضرورتوں کو پورا کرنے کا بھی اہل نہیں، موخرالذکر اصطلاح میں اُسے غریب کہا جائے گا۔ ہمیں اپنے غربت کے مسئلے کو کم ازکم اس مکمل مفہوم کے تحت سمجھنا ہوگا۔

غربت کا پھیلاؤ

ہندوستان کی غربت کا پھیلاؤ جاننے کے لیے کافی تحقیقات کی گئی ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طریقے سے تحقیقات کی گئیں۔ زیادہ تر نے ضروریات زندگی کو معیار مان کر غریبوں کی تعداد جاننے کی کوشش کی ہے۔ اس بارے میں معلومات حاصل کی گئیں کہ مختلف خاندان اپنی آمدنی کو کن مدوں پر خرچ کرتے ہیں (گھریلو بجٹ کا جائزہ)۔ اس سے غربت کی وسعت کو جاننے میں مدد ملی ہے۔ مثال کے طور پر اس طرح کی ایک رپورٹ سے پتہ چلا ہے[1] کہ 1967-68 میں ہندوستان کے تقریباً 90 فیصدی لوگ ہر روز فی کس دو روپیے سے بھی کم خرچ کر رہے تھے۔ حقیقت میں 20 فیصدی خاندانوں میں خرچ کی رقم 20 روپیے ماہوار فی کس سے بھی کم تھی۔ جس خرچ کو یہاں ذہن میں رکھا گیا ہے وہ خوراک ایندھن، روشنی، کپڑے اور دوسری غیر غذائی چیزیں ہیں۔ خوراک کے مقابلے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے ہر ایک آدمی کو ہر روز 2,250 کلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ 648 گرام اناج سے حاصل ہوتی ہے۔

---

(1) نیشنل سیمپل سروے 22 واں جائزہ (مدت جولائی 1967 جون 1968)

غذائی اشیا اور غیر غذائی اشیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہو گی، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ جائزہ لیتے وقت بازار میں ان چیزوں کی قیمتیں کیا ہیں؟ مثال کے طور پر چوتھے پنجسالہ منصوبے میں 1960-61 کی قیمتوں کے مطابق اس سطح کے خرچ کے لیے 20 روپے فی کس ماہانہ مقرر کیا گیا۔ صرف کی اسی سطح کے لیے 1972-73 کی قیمتوں کے مطابق پانچویں پنج سالہ منصوبے میں 40 روپے 60 پیسے خرچ آنے کی ضرورت تھی اگر کم سے کم خرچ کی سطح خاندانی بجٹ کے جائزے سے پتہ چل جائے تو ملک کی کل آبادی میں غریبوں کی تعداد آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر 1967-68 کے دوران 20 روپے فی کس سے بھی کم خرچ کرنے والے 20 فیصدی خاندانوں کو غریب خاندان کہا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر عام طور سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہماری کل آبادی (54 کروڑ 8 لاکھ) میں 40 فیصدی یعنی 22 کروڑ سے بھی زیادہ انسان صرف کی کم سے کم سطح سے بھی نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ مشہور ماہر معاشیات ڈانڈیکر اور رتھ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ 1980-81 تک یہ تعداد 26 کروڑ یا کل آبادی کا 38 فیصد تک پہنچ جائے گی۔

اوپر ہم نے ملک کی غریبی کی ایک سادہ سی تصویر پیش کی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غریب آدمیوں کی تعداد مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔[1] مثال کے طور پر اڑیسہ میں 65 فیصدی آبادی غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گذار رہی تھی۔ جبکہ پنجاب میں یہ تعداد 21 فیصدی تھی۔ یہ بھی قابل توجہ بات ہے

---

(1) فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری نئی دہلی کے بلیٹن اکتوبر 1969 کے اندازے کے مطابق۔

کہ غریبی کی وسعت کل آبادی کے فیصد کے حساب سے اور کل تعداد دونوں ہی دیہی اور شہری علاقوں میں مختلف ہوگی۔ ہندوستان کے معاملے میں دیہی علاقوں میں یہ تعداد زیادہ ہے۔ ڈانڈے کر اور رتھ کے مطابق 68-1967. میں یہ تعداد 166 ملین تھی۔ اس کے مقابلے میں شہری علاقے میں یہ تعداد 49 ملین تھی۔

غریب کون ہیں؟

یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ شہری اور دیہی علاقوں میں غریب کون ہیں؟ دیہی علاقوں میں غریب وہ ہیں جو بے روزگار ہیں یا جو کچھ مدت کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا مزدور جو طویل بیماری کی وجہ سے اپنی نوکری پر نہیں جا سکتا اور خاندان کی پرورش کے لیے پیسہ نہیں کما سکتا" اُسے غربت کا سامنا ہے۔ پسماندہ طبقے کے لوگوں کو بھی اس طرح کے لوگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مستقل کام نہیں کرتے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ دیہی علاقوں میں زندگی بسر کرنے کا خاص ذریعہ زمین ہے۔ بدقسمتی سے زمین دیہی آبادی کے تناسب سے برابر تقسیم نہیں کی گئی ہے۔ بہت بڑی تعداد میں ایسے گاؤں والے ہیں جن کے پاس ذرا سی بھی زمین نہیں ہے۔ وہ صرف دوسروں کی زمین پر مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ دیہی خاندانوں میں 15 فیصدی خاندان اس درجہ میں آتے ہیں، وہ محنت پر گذارہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوتھائی ایسے ہیں جن کے پاس کوئی مستقل نوکری یا روزگار نہیں ہے۔ حقیقت میں ان خاندانوں کی حالت قابل رحم ہے۔

ان میں تقریباً ساٹھ فیصدی خاندان ایسے ہیں جن میں ایک مہینے کا فی کس خرچ 15 روپے سے بھی کم ہے۔ کل ملا کر ایسے لوگوں کی تعداد پوری دیہی غریبوں کی تعداد کا نصف سے کم ہے۔

دیہی غریبوں کا ایک اہم طبقہ چھوٹے کسانوں کا ہے۔ یہ اپنی زمین بھی کاشت کرتے ہیں اور دوسروں کی زمین پر بھی کاشت کرتے ہیں۔ لیکن انھیں مزدوری میں کام کے بدلے پیداوار کا ایک حصہ مل جاتا ہے۔ دیہی دست کار بھی جن کے روایتی پیشے ختم ہو گئے ہیں، وہ بھی اس درجے میں شامل ہیں۔

شہروں میں جو غریب لوگ ہیں، ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے شہروں اور قصبوں میں کام کرنے کے لیے اپنے گاؤں چھوڑ دیے مگر یہاں کام نہیں مل سکا۔ فیکٹریوں میں اتفاقی مزدوری پر کام کرنے والے زیادہ تر لوگ اس درجے میں آتے ہیں۔ ملازمت تلاش کرنے والے اور تعلیم یافتہ بے روزگار بھی شہری بے روزگاروں میں شامل ہیں۔

ہندوستان میں غریبوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر ایسے خاندانوں کے فرد ہوتے ہیں جن کے افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس چھوٹے خاندانوں کی آمدنی کم ہونے پر بھی وہ اچھی طرح رہ سکتے ہیں۔ لیکن وسیع خاندانوں کی آمدنی زیادہ ہونے پر بھی فی کس اوسط آمدنی کم ہوگی۔

غربت دور کرنا

پانچویں منصوبے میں جو نشانہ رکھا گیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی کے سب سے نیچی سطح کے تیس فیصدی لوگوں کا صرف جو 74-1973 میں فی کس 25 روپے ماہانہ تھا اُسے 73-1972 کی قیمتوں کے مطابق 79-1978 میں

بڑھا کر 40.6 روپے فی کس ماہانہ کر دیا جائے۔ صرف کے اس درجہ کو حاصل کرنے کے لیے نچی سطح کے 30 فیصدی عوام کے ذاتی صرف کی فیصدی مقدار کو 13.5 سے بڑھا کر 18.9 کرنا پڑے گا۔ حقیقت میں غریبی کی جڑیں بہت گہری ہیں اور ہر طرف غریبی نظر آتی ہے۔ اس لیے اسے دور کرنے کے لیے ایک طویل مدتی اور بڑے لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ مندرجہ ذیل طریقوں سے ہم غربت کو بہر حال کم ضرور کر سکتے ہیں۔

(a) صنعت، زراعت، ذرائع آمد و رفت اور دوسری سہولتوں کو ترقی دے کر آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ آمدنی بڑھنے سے صرف میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس طرح غریبی دور کرنے کی طرف یہ پہلا قدم ہوگا۔

(b) ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ غریبی کی سطح سے نیچے جی رہے ہیں ان کا فی کس صرف ضرور بڑھایا جائے۔ لیکن آمدنی بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا قوی امکان ہے کہ امیر لوگ اپنے صرف کو اور بھی زیادہ بڑھا لیں اور غریب لوگ جہاں تھے وہیں رہ جائیں۔ آمدنی کی تقسیم ٹھیک طریقے سے نہ ہونے سے ایسا ہو سکتا ہے۔

امیر لوگوں کو بڑھی ہوئی آمدنی کا بڑا حصہ ملتا ہے۔ لیکن غریب لوگوں کو نئے کارخانے میں چھوٹی موٹی نوکری ہی ملتی ہے۔ اس لیے انھیں آمدنی کا بہت تھوڑا حصہ ملتا ہے۔ اور کیونکہ غریب لوگوں کی تعداد امیر لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ان کا فی کس صرف بہت کم ہوتا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ صرف ان چیزوں کی پیداوار کی جاتی ہے جنھیں امیر آدمی استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ امیر آدمی ریفریجریٹر، ٹیلیویژن، کار اور بڑے بڑے مکانوں پر زیادہ دولت خرچ کر سکتے ہیں اس لیے انھیں چیزوں کو تیار کیا جاتا ہے۔ عوام کے استعمال کی چیزیں

جیسے اناج، موٹا اور سستا کپڑا، بسیں، کم لاگت کے مکان وغیرہ کی طرف خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی اور بھی قلت ہو جاتی ہے اور چونکہ ان کی آمدنی پہلے ہی کم ہوتی ہے اس لیے وہ اپنی ضروریات کی چیزوں کے صرف کو بھی کم کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس حالت کو سدھارنے کے لیے سخت اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(a) امیروں پر زیادہ ٹیکس لگائے جائیں۔ ٹیکسوں کی اس رقم کو غریبوں پر صرف کیا جائے۔ مثال کے طور پر ان کو راشن اور کپڑا وغیرہ سستے داموں پر فراہم کیا جائے۔

(b) امیروں کی پسند یا صرف کی چیزوں کی پیداوار کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ صنعتوں کو ایسی چیزوں کے لیے لائسنس یا بنک سے قرض نہ دیا جائے جو امیروں کے استعمال کی چیزیں بناتی ہیں۔ دوسری طرف ایسی صنعتوں کو لائسنس اور مالی امداد دی جائے جو عوام کے لیے چیزیں تیار کرتی ہیں۔

(c) غریب مزدوروں کے کام کرنے کے حالات اور ان کی اجرت کو بہتر کیا جائے مثال کے طور پر جن لوگوں کی عارضی ملازمت ہے ان کی ملازمت کو باقاعدہ بنایا جائے۔ خواہ وہ کھیتوں میں کام کرتے ہوں یا فیکٹریوں میں۔

(d) زمین کی زیادہ منصفانہ تقسیم کی جائے۔ ایک خاص مقررہ حد سے زیادہ کسی بھی خاندان کو زمین نہ رکھنے دی جائے۔ اس حد سے زیادہ زمین جس کے پاس ہو اسے ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائے جن کے پاس زمین بالکل نہیں ہے۔ یا جو زمین کے بہت چھوٹے سے ٹکڑے کے مالک ہیں۔

نئے کارخانوں اور اداروں میں ان لوگوں کو بڑی تعداد میں ملازمتیں دی جاسکتی ہیں جو غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں ان نوکریوں پر کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ دوسرے لوگوں کے لیے روزگار کی خاص اسکیمیں شروع کی جاسکتی ہیں۔ ایک اہم تدبیر دیہی ترقی کے کاموں کو شروع کرنا ہے جس میں زمین برابر کرنا۔ نہریں کھودنا۔ سڑکیں بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ اس تجویز پر بھی غور ہونا چاہیئے کہ حکومت بے روزگار لوگوں کو اس وقت تک مالی امداد دے جب تک ان کو روزگار نہ مل جائے۔

اوپر جن تدبیروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کچھ پر عمل درآمد کیا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ اس کی اہم وجہ اچھے نظم ونسق کی کمی، سرمائے کا غلط استعمال اور رشوت خوری ہے۔ یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ حال ہی میں حکومت کی طرف سے 20 نکاتی معاشی پروگرام نافذ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے پورا ماحول بدل گیا ہے۔ ہر جہت میں کمزور طبقوں کی مدد کرنے کی ایک ہمہ گیر جدوجہد کی جارہی ہے تاکہ غریبی دور ہوسکے۔

خُلاصَہ

غربت کی تعریف

دوسروں کے مقابلے میں ایک شخص نسبتاً غریب ہوسکتا ہے، جبکہ اس کی آمدنی (یعنی اس کا معیار زندگی) دوسرے کے مقابلے میں کم ہو۔ یا پھر وہ بھی غریب ہے جس کے پاس روٹی، مکان اور کپڑا جیسی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے بھی پیسہ نہ ہو، جو ایسی ضروریات ہیں جن کے بغیر وہ زندہ نہیں

رہ سکتا۔ پہلی صورت میں غریبی ایک اضافی چیز ہے (یعنی دوسروں کے مقابلے میں) اور دوسری صورت میں ہم غربت کو اس کے قطعی مفہوم میں دیکھتے ہیں۔ اس باب میں ہم نے ہندوستان کی غربت کے مسئلے پر دوسرے نظریے کے مطابق غور کیا ہے۔

ہندوستان میں غربت کے اندازے

گذشتہ چند سالوں میں غربت کے مسئلے کی نوعیت کا اندازے لگانے کے لیے بہت سی تحقیقات کی گئی ہیں۔ ان تمام تحقیقات کا یہی نتیجہ نکلا ہے کہ اس ملک میں بقائے زندگی کے لیے کم از کم اتنی خوراک ضروری ہے جو ہر فرد کو 2,250 کلوریز مہیا کر سکے۔ جو لوگ کم سے کم یہ بھی حاصل نہیں کرتے۔ وہ "غریبی کی سطح سے نیچے" رہتے ہیں۔ ذیل میں ان تحقیقات کے نتائج دیے جاتے ہیں۔

اوّل غربت کی سطح سے نیچے لوگوں کی اصل تعداد کتنے ہی سالوں سے بڑھ رہی ہے۔ چاہے کل آبادی کی فیصدی کے حساب سے یہ نہ بڑھی ہو۔ دوسرے، فیصدی آبادی (اصل تعداد میں) میں غربت کی حالت شہری علاقوں کے مقابلے میں دیہی علاقے میں زیادہ ہے۔ تیسرے، غربت دیہی علاقوں میں اُس وقت بڑھتی ہے جب فصل خراب ہو۔ آخر میں غریبی کی حالت نہ صرف دیہی اور شہری علاقوں میں مختلف ہے بلکہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھی مختلف ہے۔

غریب کون ہیں؟

گاؤں میں خاندانوں کی ایک بڑی تعداد کے پاس کوئی زمین نہیں ہے

اور وہ دوسروں کے کھیتوں پر اُجرت پر کام کرتے ہیں۔ یہ بے زمین زرعی مزدور، کہلاتے ہیں۔ بے زمین زرعی مزدوروں کو نہ تو پورے سال میں مستقل روزگار ملتا ہے اور جب وہ برسرِ روزگار ہوتے ہیں تو ان کو نہ اچھی اجرت ہی ملتی ہے۔ اس لیے یہ طبقہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ چھوٹے کسان بھی جن کے پاس کاشت کے لیے کافی زمین نہیں ہے اور وہ اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کرنے کے لیے دوسروں کے کھیتوں پر اتفاقی مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہیں دیہی غریبوں میں شامل ہیں۔ چھوٹے زرعی کرایہ دار جو دوسروں کی زمین پر کاشت کرتے ہیں وہ بھی غریب ہیں کیونکہ زمینداروں کو کرایہ ادا کرنے کے بعد ان کے پاس بہت تھوڑا ہی بچ پاتا ہے۔ شہری غریبوں میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہیں۔ (1) قطعی بے روزگار لوگ، صنعتی مزدور اور تعلیم یافتہ بے روزگار۔ (2) خود بہ روزگار لوگ جن کی آمدنی وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت کم ہے اور (3) صنعتوں اور سروس سیکٹر میں کام کرنے والے اتفاقی مزدور اور جو مستقل ملازم نہیں ہیں۔ تاہم اس مسئلہ پر حکومت گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔

غربت دور کرنے کے لیے اقدامات

دیہی غریبوں (یعنی بے زمین زرعی مزدور، چھوٹے کسان اور زرعی کرایہ دار) کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے صوبائی سرکاروں نے زمینی اصلاحات کے پروگرام پر بڑی تیزی سے عمل شروع کر دیا ہے۔ ان اصلاحات میں زمینداری ختم کرنا، زرعی کرایہ داروں کا تحفظ، کرایہ کو کم کرنا، زمین کی حد مقرر کرنا (یعنی زیادہ سے زیادہ رقبہ جو ایک خاندان رکھ سکتا ہے۔) اور بے زمین کسانوں کو فالتو

زمین تقسیم کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ انتشار آراضی اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہونے سے روکنے کے لیے چکبندی قانون بنائے گئے اور اب زیادہ تر ریاستوں نے چکبندی کے کام کو پورا کر لیا ہے۔ اس کا مقصد چھوٹے کسانوں اور کرائے داروں کے کھیتوں کے رقبہ میں اضافہ کرنا ہے تاکہ ان پر کرائے کا بوجھ کم ہو اور کرائے داری میں استحکام آئے۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ سستے قرضے، اچھے بیج اور کھیتی کے آلات، کھاد وغیرہ فراہم کیے گئے۔ اس کے علاوہ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل وغیرہ خریدنے کے لیے کسانوں کو لمبی مدت کے قرضے بھی دیے گئے ہیں۔ ان حاشیائی مقاصد کے پیش نظر حکومت نے دوسری بہت سی اسکیمیں بنائی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی (Farmer's Development Agency,)

کسانوں اور زرعی مزدوروں کی ایجنسی (Marginal Farmers and Agricultural Labourers Agency,)

دیہی روزگار کے لیے فوری پروگرام (Crash programme for Rural Employment,)

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کی اسکیم (Drought Prone Areas Scheme,)

ترقی کے مرکز (Growth Centres etc.)

وزیراعظم کا معاشی پروگرام

جولائی 1975 سے حکومت نے نیا اقتصادی پروگرام شروع کیا ہے حکومت نے دیہی غریبوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کا اعلان کیا ہے۔

(1) نیشنل اکونومک پروگرام (NEP) کے تحت زمینی اصلاحات کو تیزی سے نافذ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ زیادہ تر ریاستیں زمین کی حدبندی کے قوانین پاس کر چکی ہیں اور زمین کے ریکارڈ تیار کیے جا رہے ہیں۔

(2) دیہاتوں میں روزگار کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے حکومت نے ایک دیہی روزگار تحقیقاتی ٹیم مقرر کی ہے۔
(3) زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرت پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔
(4) بندی (غلام) مزدور رکھنے کے رواج کو قانوناً ختم کر دیا گیا۔
(5) دیہی علاقوں میں کاریگر، بے زمین مزدور، چھوٹے اور حاشیائی کسانوں کے قرضوں کی ادائیگی کو منسوخ کر دیا ہے۔
(6) دیہات کے غریب طبقے میں قرضوں کی سہولیات کو بڑھانے کے لیے حکومت نئے قسم کے بنک قایم کرنے کی ایک اسکیم پر عمل کر رہی ہے۔ پانچ ایسے علاقائی بنک قایم کیے جا چکے ہیں اور اُمید ہے کہ 1976 کے آخر تک ان کی تعداد پندرہ ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا اقدامات سے دیہی آبادی کے ساتھ سماجی انصاف کی توقع ہے۔

گیارھواں باب

آبادی اور خوراک کا مسئلہ

تعارف

اس سے قبل ہم پڑھ چکے ہیں کہ معاشی ترقی میں آبادی کا کیا رول ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ آبادی ترقی کا ایک ذریعہ بھی ہے اور ایک رکاوٹ بھی۔ اگر آبادی بہت تیزی سے نہیں بڑھتی اور افرادی قوت اچھی طرح تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ ہے تو آبادی ایک مثبت وسیلہ ہے یعنی یہ ترقی کا اہم ذریعہ بن جاتی ہے لیکن اگر آبادی بہت تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک اہم اور بنیادی مسئلہ نئے لوگوں کے لیے خوراک فراہم کرنے کا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسا ملک تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کافی اناج پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جس کا نتیجہ وسیع پیمانہ پر بھوک اور قحط ہے یا غیر ملکی درآمد پر انحصار۔

پچھلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ایک بڑے طبقے کو وہ کم سے کم خوراک بھی نہیں مل پاتی جو انسانی زندگی کو قایم رکھنے کے لیے ضروری ہے حقیقت میں ہمارے لوگوں کا اناج کا فی کس استعمال بہت کم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آج کل آبادی 2.5 فیصدی سالانہ کی شرح سے

بڑھ رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر باقی تمام چیزیں ویسی ہی رہیں تو بھی فی کس صرف کی موجودہ سطح کو قایم رکھنے کے لیے اناج کی پیداوار 2.5% سالانہ کے حساب سے بڑھنی چاہیے۔ ایسا اس صورت میں ہوگا جب ہماری فی کس آمدنی وہی رہے۔ جب فی کس آمدنی بڑھتی ہے تو اشیائے خوردنی کی طلب بھی بڑھ جاتی ہے لیکن یہ طلب اتنی نہیں بڑھتی جتنی کہ آمدنی بڑھتی ہے۔ عام طور سے لوگ اپنی آمدنی کا ایک حصہ ہی اشیائے خوردنی پر خرچ کرتے ہیں۔ آمدنی میں مزید اضافے سے اشیائے خوردنی پر خرچ کا تناسب گھٹ جاتا ہے۔

بڑھی ہوئی آمدنی کا جو حصہ خوراک پر خرچ ہوتا ہے اور آبادی جتنی تیزی سے بڑھتی ہے، ان دونوں باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک ملک میں اشیائے خوردنی کی طلب کس شرح سے بڑھے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر سال 2.5 فیصدی سے اضافہ ہوتا ہے۔ اور فی کس اصل آمدنی 1.0 فیصدی سالانہ بڑھتی ہے۔ اس آمدنی کا آدھا حصہ اشیائے خوردنی پر خرچ ہوتا ہے۔ اس حساب سے اناج کی طلب تین فیصدی سالانہ بڑھنی چاہیئے۔ (یعنی 2.5 فیصدی + ایک فیصدی کا آدھا = 3 فیصدی)۔ اگر اناج کی رسد اس شرح سے بڑھتی ہے تو زیادہ مشکلات کھڑی نہیں ہوں گی۔ اگر ملک کی پیداوار سے ہی یہ رسد پوری ہو جائے تو ہم خود کفیل رہیں گے۔ اگر طلب کے مقابلے میں خوراک کی پیداوار کم ہے تو اشیائے خوردنی بھی یقیناً کم ہو جائیں گی اور یہ فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا مسئلہ اتنا ہی سنگین ہو جائے گا۔ حقیقت میں کل پیداوار طلب میں اضافے کی شرح سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس حالت میں ہم ذخیرہ جمع کرسکتے ہیں۔ جو مصیبت کے وقت اور خراب موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیداوار میں اضافے کی شرح طلب میں اضافے کی شرح سے کم از کم

ایک فیصدی سے زیادہ رہنی چاہیے۔ ہندوستان میں پیداوار کی شرح تقریباً فیصدی سالانہ ہونی چاہیئے۔ یہ اعداد و شمار صرف مثال کے لیے دیے گئے ہیں۔ کمیشن برائے زرعی قیمت (The Agricultural Prices Commission) نے اپنی اگست 1970، کی رپورٹ میں یہ اعداد و شمار دیے ہیں۔

خوراک کی پیداوار کی صورت حال

جب ہم اشیائے خوراک کی پیداوار کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب گیہوں، چاول، جوار، باجرہ، مکئی، جیسے اناجوں اور چنا، ارہر، مونگ، ارد وغیرہ دالوں سے ہوتا ہے۔ 1951-52. کی منصوبہ بندی کے بعد سے ان سب کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اگر ہم صرف پیداوار کے اضافے کی مقدار کو نگاہ میں رکھیں تو یہ اضافہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ مثال کے طور پر 1950-51 میں پیداوار 55 ملین ٹن تھی۔ اور 1970-71. میں بڑھ کر 108.4 ملین ٹن ہو گئی۔ یہ اب تک کی رکارڈ پیداوار ہے۔ آنے والے دو سالوں میں یہ کم ہو گئی ہے اور 1972-73 میں 97 ملین ٹن رہ گئی۔ اناج کی پیداوار کے لحاظ سے چوتھے پنج سالہ منصوبہ یعنی 1969-70. کے بعد یہ سب سے خراب سال تھا۔ 1973-74 میں پیداوار ایک بار پھر 104.0 ملین ٹن ہو گئی۔ لیکن 1974-75. میں یہ پھر 101 ملین ٹن رہ گئی۔ موجودہ سال (1975-76) میں یہ امید ہے کہ اناج کی کل پیداوار 11 کروڑ ٹن ہو گی۔ لیکن اس قابل قدر اضافے نے اس خوراک کے مسئلے کی سنگینی کو جس کا سامنا آزادی کے بعد سے ہمیں کئی مرتبہ کرنا پڑا پس پشت ڈال دیا ہے۔ 1957-58، 1959-60، 1962-63، 1965-66، 1968-69، 1972-73، اور یہاں تک 1974-75. میں اس

مسئلہ سے ہم خاص طور سے دوچار رہے۔ ان سالوں میں اناج کی پیداوار کم رہی۔
آخر ایسا کیوں ہوا؟ اوّل تو بازار میں اناج کی کمی رہی۔ پھر قیمتیں بڑھیں اور اناج
عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونے لگا۔ غریب لوگ بُری طرح متاثر ہوئے۔ اس
حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کو مداخلت کرنی پڑی۔ اور اس نے کسانوں
اور اناج کے تاجروں سے اناج خریدنا شروع کیا۔ 1973 میں وہ وقت بھی
آیا جب حکومت نے اناج کی تمام تھوک تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس نے
سرکاری دکانوں کے ذریعہ سستے اناج کی تقسیم کا کام شروع کر دیا۔ حکومت نے
جب یہ اقدامات کیے۔ قیمتوں پر کنٹرول کیا اور اناج کو ملک کے ایک حصّے سے
دوسرے حصّے میں لے جانے پر پابندی عاید کر دی تو کالا بازار پیدا ہو گیا۔ جن لوگوں
کے پاس کافی سرمایہ تھا، وہ کالے بازار میں اونچی قیمتوں پر اناج خرید سکتے تھے۔
یہاں تک کہ کبھی کبھی حکومت بھی اس کالے بازار کی وجہ سے اناج خرید نہیں پاتی۔
اس کے نتیجے میں ملک کے بہت سے حصّوں میں اناج کی سستی سرکاری دکانوں
کے نظام کو سخت دھکّا لگا۔ اس سے غریبوں کو اور بھی زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔
بڑے کسانوں اور تاجروں کا تعاون نہ ملنے سے حکومت کو ایک بار پھر غیر ملکوں سے
اناج خریدنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ کچھ سال پہلے اناج کی درآمد ختم کرنے کا فیصلہ
کیا جا چکا تھا۔ 71-1970 کی رکارڈ پیداوار کے بعد اس فیصلہ پر عمل کرنا تھا۔ لیکن بعد
میں فصل خراب ہونے اور اوپر بیان کی گئی صورتِ حال کی وجہ سے حکومت اپنے درآمد
نہ کرنے کے فیصلے پر قایم نہ رہ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اناج کی درآمد اب بھی جاری ہے
اور اب ہمیں اس پر بہت زیادہ سرمایہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس سے پہلے ہم
امریکہ سے ایک خاص انتظام یعنی پی۔ ایل 480 کے تحت گیہوں خرید سکتے تھے
اب ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس لیے اب ہمیں بین الاقوامی منڈیوں سے

بین الاقوامی قیمت پر گیہوں خریدنا پڑتا ہے۔

اناج کی پیداوار سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ یہ خواہش کے مطابق نہیں بڑھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر چوتھے منصوبے کے دوران کل پیداوار کا نشانہ 520 کروڑ ٹن تھا۔ لیکن حقیقی پیداوار 512.3 ملین ٹن ہوئی ,1973-74 کا نشانہ 115 ملین ٹن تھا جب کہ کل پیداوار 104.0 ملین لاکھ ٹن ہوئی 1976-77 کی پیداوار امید ہے نشانے سے اوپر جائے گی۔

خوراک کی دستیابی

خوراک کی کل دستیابی (یعنی کل رسد) اصل پیداوار (یعنی کل پیداوار۔ استعمال شدہ بیج) اور اصل درآمد کے برابر ہے۔ اس میں اناج کی اس مقدار کو گھٹانا یا جوڑنا پڑتا ہے۔ جو سرکاری خرید یا بکری کے ذریعہ حکومت کے کل ذخیرے[1] میں ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے 1955-56 میں کل 52.4 ملین ٹن اناج اور دالیں دستیاب تھیں۔ 1971-72 میں یہ مقدار بڑھ کر 86.5 ملین ٹن ہو گئی۔ 1972-73, میں یہ مقدار پھر گھٹ کر 79.3 ملین ٹن رہ گئی۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اس مدت میں کل دستیابی میں اضافہ ہوا پھر بھی فی کس کے حساب سے یہ مقدار 1955-56 میں 431 گرام سے گر کر 1972-73 میں صرف 418 گرام رہ گئی۔ اس کمی کی وجہ آبادی میں غیر معمولی اضافہ تھا۔

صرف یہ اہم نہیں ہے کہ فی کس کتنا اناج دستیاب ہے بلکہ اتنا ہی اہم یہ

---

(1) سرکاری ذخیرہ میں کمی ہونے کا مطلب ہے تقسیم کے لیے عوام کی رسد میں اضافہ۔ اس کے برخلاف جب حکومت اپنے ذخیرہ میں اضافہ کرتی ہے تو عوام کو خریدنے کے لیے اتنا ہی کم اناج ملتا ہے۔

بھی ہے کہ دستیاب اناج کس قسم کا ہے؟ ہر روز جو کچھ صرف کیا جاتا ہے اس میں صرف اناج ہی نہیں بلکہ ایسی چیزیں بھی ہونی چاہئیں جن میں وٹامن، پروٹین وغیرہ جیسے غذائی اجزا بھی ہوں۔ ایک اوسط ہندوستانی کی خوراک میں دودھ، پھل، سبزی، انڈے، گوشت اور سبزیوں کے پروٹین کی کمی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں فی کس اناج کی دستیابی میں کمی سے نقصان پر بھی توجہ دی جائے۔

1955-56 سے لے کر 1972-73 تک اگرچہ اناج کی دستیابی فی کس 361 گرام سے بڑھ کر 378 گرام ہوگئی۔ لیکن اس مدت میں دالوں کی دستیابی جن میں پروٹین زیادہ ہوتا ہے 70 گرام فی کس روزانہ سے کم ہو کر 40 گرام فی کس روزانہ رہ گئی۔ خوراک کے مسئلہ کے اس پہلو پر بھی آنے والے سالوں میں خاص طور پر توجہ دینی پڑے گی۔

خوراک کی تقسیم اور قیمتیں

کمی کے زمانے میں قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جس سے عام آدمی کو بہت نقصان ہوتا ہے اور وہ اپنی کم سے کم ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کی آمدنی کے مقابلے میں قیمتیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ 1974 تک یہ رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ خوراک کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھی ہیں۔ جب کہ تھوک قیمتوں کے اشاریہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1965-66 کے آخری ہفتے میں 100=1961-62 کو بنیاد مان کر) اشیائے خوردنی کی قیمتوں کا اشاریہ 150 تھا۔ نومبر 1973 کے آخری ہفتے میں یہ بڑھ کر 301 ہوگیا۔ 1974 کے پہلے چھ مہینوں میں قیمتوں میں 23 فی صدی اضافہ ہوا۔ 1975 سے حکومت کے اقدامات کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی قیمتیں خاص طور پر کم ہو رہی ہیں۔ خوراک سے متعلق ایک صحت مند

پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ قیمتیں ایک معقول سطح پر پہنچ کر مستحکم ہو جائیں۔

سب سے بڑی ضرورت پیداوار بڑھانے کی ہے۔ اس کے لیے کسانوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اُسے اپنی پیداوار کی جو قیمت ملتی ہے وہ کافی اطمینان بخش اور پیداوار بڑھانے کے لیے ہمت افزا ہونی چاہیے۔ یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ صارف چاہتا ہے کہ اُسے کم سے کم قیمت پر اناج ملے۔ اور کسان چاہتا ہے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ قیمت ملے۔ ایسی حالت میں کسی نہ کسی سمجھوتے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی کسان کو ایسی قیمت دینے سے انکار نہیں کرے گا جو پیداوار بڑھانے میں مدد دے سکے۔ لیکن اسے حکومت کی طرف سے مقررہ کم ترین قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر گیہوں کی کم ترین قیمت پہلے سے طے کی جا سکتی ہے۔ اگر منڈی کی اصل قیمتیں اس قیمت سے نیچے آ جائیں تو حکومت اپنی مقرر کردہ قیمت پر اناج خرید سکتی ہے۔ لیکن کم ترین قیمت کا جواز اُس حالت میں ہوگا جب بڑھتی قیمتوں کے زمانے میں بازار میں ایسی معقول قیمت ہو جس پر حکومت عوام میں تقسیم کے لیے اناج حاصل کر سکے۔ کم ترین قیمتوں پر خریدا ہوا پچھلا ذخیرۂ اناج اور موجودہ ذخیرۂ اناج دونوں حکومت کے پاس ایسی رسد ہے جسے وہ اناج کی کمی کے دنوں اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں باہر نکال سکتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں پیداکار کے تعاون کی بہت اہمیت ہے اگر یہ تعاون حکومت کو حاصل نہ ہو سکے تو وہ پیداکار سے مقررہ قیمت پر اناج کی جبری وصولیابی کر سکتی ہے۔ اس طرح کے دباؤ کے لیے حکومت لیوی ٹیکس بھی لگاتی ہے۔ جب ایسا کیا جاتا ہے اس وقت کسانوں کی کم سے کم پیداواری لاگت کی مانگ قطعی جائز ہے۔ اگر مقررہ قیمتیں اس سے بھی کم ہیں تو کسانوں کو

سرکاری امداد ملنی چاہیئے۔ اور بیج، پانی، کھاد جیسی ضروری چیزیں کم قیمت پر مہیا کی جانی چاہیئں۔

ایسی معیشت جہاں چیزیں کم یاب ہیں۔ وہاں حکومت کو رعایتی قیمتوں پر اناج کی تقسیم کرنی پڑے گی۔ خاص طور سے سماج کے کمزور طبقوں کے لیے تو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ بڑے شہروں میں جہاں اناج کی طلب بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں بھی اس طرح کے انتظامات ہونے چاہیئں۔ (ایسے شہر دہلی کلکتہ بمبئی اور مدراس ہیں، جہاں مانگ زیادہ ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ مقامی آبادی زیادہ ہے بلکہ باہر سے آنے والے تاجر، غیر ملکی سیاح اور زائرین بڑی تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں) حکومت کو مناسب قیمتوں کی دکانوں کے ذریعہ اناج کی تقسیم کو جاری رکھنے کے لیے براہ راست پیداکاروں اور منڈیوں سے بھی اناج خریدنا پڑے گا۔ ملک کے حالات خراب ہونے کی صورت میں حکومت کو دوسرے ملکوں سے بھی اناج خریدنا پڑ سکتا ہے۔ اس طرح جمع کیے ہوئے ذخیرہ کا ایک حصہ مشکل وقت کے لیے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ باقی موجودہ ضرورت کے لیے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ اناج کی تقسیم کے لیے حکومت کی کارکردگی کا انحصار صرف اناج کی وصولیابی پر ہے کیونکہ حکومت کو مناسب قیمت پر اناج بیچنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بڑھی ہوئی قیمت پر اناج نہیں خرید سکتی۔ اس وجہ سے کسانوں سے اناج وصول کرنے کی سرکار کی جبری پالیسی کم کامیاب ہوتی ہے۔ بہرحال حکومت کی ایک مقررہ قیمت پر اناج حاصل کرنے کی مضبوط پالیسی کی وجہ سے اناج کی تقسیم کا نظام اور قیمتیں دونوں ہی قابو میں ہیں۔

خوراک کے معاملے میں طلب کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ آبادی کے

اضافے کو روکنے کے لیے بھی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں خاندانی منصوبہ بندی کو مقبول بنانا بڑا مددگار ہو سکتا ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کی آمدنی کو بڑھنے سے نہیں روکنا ہے۔ ہمارا یہ یقین ہے کہ جیسے آمدنی بڑھتی ہے ویسے ہی خوراک پر خرچ کم ہوتا ہے۔ آمدنی کے بڑھنے سے نہیں بلکہ آبادی کے بڑھنے سے خوراک کی طلب میں اضافہ ہوگا۔

خلاصہ

مسئلہ

خوراک کی طلب اصل آمدنی کی سطح پر منحصر ہے۔ کم آمدنی والے لوگ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ خوراک پر خرچ کرتے ہیں۔ جب آمدنی بڑھتی ہے تو لوگ اپنی آمدنی کا صرف ایک حصہ ہی خوراک پر خرچ کرتے ہیں۔ آمدنی میں ہر اضافے سے خوراک پر خرچ کم ہوتا جاتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں لوگ اپنی زائد آمدنی کا 50% خوراک پر خرچ کرتے ہیں۔ ہماری آبادی 2.5% فیصدی سالانہ شرح سے بڑھ رہی ہے اور ہماری فی کس آمدنی 1% سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔

اگر لوگ اپنی زائد آمدنی کا آدھا حصہ خوراک پر خرچ کرتے ہیں تو آبادی کی شرح میں اور فی کس آمدنی میں اضافے کا مطلب یہ ہوگا کہ اشیائے خوردنی کی طلب میں اضافہ کی شرح 3% ہونی چاہیے۔ یعنی 2.5% + .5% (بڑھتی ہوئی فی کس آمدنی 1% کا آدھا۔) موجودہ فی کس صرف کو برقرار رکھنے کے لیے بھی 3% کے حساب سے اناج کی رسد بڑھنی چاہیے۔ حقیقت میں اگر آمد و رفت اور ذخیرہ کرنے وغیرہ میں جتنا اناج ضائع ہوتا ہے اس کو بھی اس میں شامل کرلیں

تو اناج کی رسد میں 3% سے بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

اناج کی پیداوار

اس میں شک نہیں گذشتہ پچیس سالوں میں ملک میں اناج کی پیداوار دگنی ہو گئی ہے۔ لیکن اسی دوران آبادی 50% بڑھ گئی ہے اور فی کس آمدنی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھی ہے۔ نتیجہ میں اناج کی پیداوار کے مقابلے میں اس کی طلب بڑھ گئی۔ چنانچہ دوسرے ملکوں سے ہمیں اناج کی ایک خاصی مقدار درآمد کرنی پڑی۔ نہ صرف بڑھتی ہوئی طلب سے اناج کی پیداوار کا کوئی تال میل نہیں رہا۔ بلکہ پیداوار کی مقدار میں بھی یکسانیت نہیں رہی۔ جب پیداوار کم ہوتی ہے تو قیمتیں غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ اچھی فصل کے زمانے میں قیمتیں گر جاتی ہیں اور خشک سالی کے زمانے میں قیمتیں تیزی سے بڑھ جاتی ہیں ذخیرہ خوروں اور سٹے بازوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ قیمتیں بڑھنے کی صورت میں غریب طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

خوراک کی موجودہ پالیسی

اناج کی قیمتوں سے صنعتی لاگت متاثر ہوتی ہے اور قیمتوں کی عام سطح پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ (دیکھئے ساتواں باب) اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اناج کی قیمتوں میں استحکام پیدا کیا جائے۔ اناج کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے اور اس کی منصفانہ تقسیم کے لیے حکومت کو آزاد مارکیٹ کی طاقتوں پر قابو رکھنا پڑتا ہے۔ موجودہ طریقے کے مطابق حکومت براہ راست

مارکیٹ سے اناج حاصل کرتی ہے اور صرف لائسنس یافتہ تاجروں کو ہی منڈیوں
سے اناج خریدنے کی اجازت دیتی ہے۔ لائسنس یافتہ تاجروں کو اپنے 50%
اناج کے ذخیرہ کو مقررہ قیمت پر حکومت کو دینا ہوتا ہے۔ باقی حصّہ وہ کھلی
مارکیٹ میں فروخت کرسکتے ہیں۔ اناج کی زائد پیداواری ریاستوں میں اناج
حاصل کرنے کی غرض سے اب ہر ریاست کو ایک علیحدہ زون بنا دیا گیا ہے اور
مختلف ریاستوں کے درمیان اناج کے لانے اور لے جانے کا کام صرف لائسنس
یافتہ لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ ان سے کھلے بازار اور لائسنس یافتہ تاجروں سے حکومت
جو اناج کے ذخیرے جمع کرتی ہے ان سے کم پیداوار والی ریاستوں کی
ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

اقدامات

خوراک کے مسئلہ کا حل پیداوار میں اضافے اور آبادی کی بڑھتی ہوئی
شرح کو روکنے میں ہے۔ اس دوران حکومت اناج کی حصولی اور عوام میں اناج
کی تقسیم کے موجودہ طریقے کو جاری رکھے گی۔ پیداوار بڑھانے کے لیے اچھے
بیجوں، کھاد، کیڑے مار دواؤں کا استعمال زیادہ سے زیادہ زمین پر کیا جائے گا۔
پچھلے باب میں ہم نے زمینی اصلاحات کے اقدامات جیسے کھیتوں کے رقبے کو
محدود کرنا اور فالتو زمین کو بے زمین مزدوروں میں تقسیم کرنا، کرائے کے قوانین اور
کرائے دار کے تحفظ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب اقدامات زرعی پیداوار کو بڑھانے
کے لیے ضروری ہیں۔ سستے قرض، اچھے بیجوں کی فراہمی، زرعی آلات، کھاد، کیڑے
مار دوائیں وغیرہ چھوٹے کسانوں کو کاشت کے نئے طریقے اپنانے کے قابل
بنا دیں گے اور اس طرح پیداوار بھی بڑھ جائے گی۔

بارہواں باب

زراعتی پسماندگی اور دیہی ہندوستان کو جدید بنانا

تعارف

ہندوستانی زراعت ایک عرصے سے پسماندہ ہے۔ ابھی تک کسان ان پڑھ اور جاہل تھا۔ وہ توہم پرست تھا۔ وہ اپنے کام کے طریقے اور رہن سہن کے ڈھنگ میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کا مخالف تھا۔ ہمارے کسان کی چند نمایاں خصوصیات میں۔ اس کے دقیانوسی خیالات پرانے رسم ورواج، اس کی قسمت پرستی۔ صرف اپنے اور اپنے خاندان کی ضرورت کے لیے پیداوار کرنا۔ نفع کی پرواہ نہ کرنا۔ نفع کو پیداواری کاموں میں نہ لگانا وغیرہ۔ ایک زمانہ تھا جب وہ کیمیائی کھاد کا بھی مخالف تھا۔ ملک کے بہت سے کسانوں نے مشینوں اور ٹریکٹروں کے استعمال کو پسند نہیں کیا۔ ان سب وجوہات سے وہ پسماندہ رہے۔ اس لیے ہندوستانی زراعت بھی پسماندہ رہی۔ اور صرف گذر بسر کا ذریعہ ہی بنی رہی۔ یہ ایک تجارت نہیں بن سکی۔ ان حالات میں جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ یعنی آمدنی کم، سرمایہ کاری کم، جدید زندگی سے دور، میکانکی طریقے محدود۔ نئے طریقوں اور فصل کاری کے نئے طریقوں سے لاعلمی، دیہی آبادی غیر منظم۔ نتیجہ میں معیار زندگی پست رہا۔ آج بھی دیہی علاقوں میں غریبوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان پڑھ لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے

گاؤں میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف برائے نام ہے جو زراعت کے نئے طریقوں اور نئے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کو تیار ہوں۔ دوسرے لفظوں میں گاؤں کی حالت اور شہر کے تجارتی اور صنعتی مرکزوں کے حالات میں نمایاں فرق ہے۔ ہماری زراعت کی پسماندگی کا یہی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کے سماجی، معاشی، سیاسی اور علاقائی پہلو ہیں۔

دیہی ترقی کا مسئلہ

گاؤں کی ترقی کے بغیر ہندوستان کی معاشی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی لگ بھگ اسی فیصدی آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ جب تک سماج کے اس خاص طبقے کی معاشرتی اور معاشی حالت کو بہتر نہیں کیا جائے گا۔ تب تک معاشی ترقی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں اپنی دیہی آبادی کے لیے کیا کرنا ہے؟ کیا یہ کافی ہے کہ انھیں صرف تعلیمی سہولتیں فراہم کردیں۔ وہ پڑھنا لکھنا سیکھیں اور اس کے بعد باقی کام خود کریں یا ہم انھیں صرف سرمایہ اور زمین دے دیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ باقی ترقی وہ خود کرلیں گے۔ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ان کے لیے سڑکیں بنوادیں، منڈیاں کھلوادیں، کنویں بنوادیں اور باقی کاموں کو ان کے لیے چھوڑ دیں۔ کیا یہ کافی ہوگا کہ سب گاؤں والے کاشتکاری اپنالیں اور صنعتوں کو شہر کے لوگوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہی زندگی میں ان سب ہی پہلوؤں کا ایک ساتھ ترقی کرنا ضروری ہے۔

کسان کو اپنے کام کو اچھی طرح جاننا چاہیے۔ اُسے ترقی یافتہ طریقوں، بیجوں اور کھاد کو زراعت میں استعمال کرنا چاہیے۔ کسان کو نئے طریقوں کا استعمال

سکھایا جائے اور اسے بیج اور کھاد دیے جائیں۔ اس کی فصل کی اُسے اچھی قیمت ملنی چاہیئے۔ تاکہ اُس کی حوصلہ افزائی ہو۔ ایسے انتظامات کیے جائیں کہ اس کی پیداوار بازاروں میں بک سکے۔ کھیتی کے لیے اسے جس سرمایہ کی ضرورت ہو وہ بھی اسے مہیا ہونا چاہیئے۔ فرصت کے وقت میں (یعنی جب اسے کھیتی باڑی کے کام سے فرصت ہو) اسے کوئی کام دیا جائے۔ اور گھریلو اور چھوٹی دستکاریوں کا انتظام ہونا چاہیئے۔ گاؤں کے کچھ لوگوں میں کارخانے چلانے کی بھی صلاحیت ہوسکتی ہے۔ اس کام کے لیے ایسے لوگوں کو ضروری سہولتیں ملنی چاہئیں۔ ایک صاف ستھری اور معقول زندگی گذارنے کے لیے انھیں مکان، تفریح، تعلیم علاج اور صفائی وغیرہ کی سہولیات ملنی چاہئیں۔ جب دیہی زندگی کے ان سب پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر ایک ساتھ ترقی کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ تو ہم اُسے دیہی ترقی کا مکمل نظریہ (integrated approach of rural development) کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ گاؤں والے معاشی، سماجی و تہذیبی طور سے مکمل انسان بن جائیں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ان کا کاروبار بڑھے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ باسلیقہ اور تعلیم یافتہ ہوں۔ انھیں پوری معلومات ہوں اور جدید زندگی کی تمام ضروری سہولیات میسر ہوں۔

دیہی ہندوستان کو جدید بنانے کی کوشش

اوپر بیان کیے گئے مکمل نظریے کے تحت ہندوستان کو جدید طرز پر لانے کے لیے کافی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی اور ونوبا بھاوے نے اس سلسلہ میں کام کیا۔

1948 میں سرکاری طور پر اس کام کو شروع کیا گیا۔ اور اتر پردیش کے

اٹاوہ ضلع میں دیہی ترقی کا ایک تجرباتی پروگرام بنایا گیا۔ یہ جگہ اس لیے چنی گئی تھی کہ ترقی کے یہاں امکانات تھے اور یہاں کی مقامی آبادی اور وسائل نئے پروگرام کے لیے تیار تھے۔ اس پیش رو ترقی یافتہ اسکیم کا خاص مقصد یہ تھا کہ منتخب جگہ پر جو ترقیاتی کام کیا جائے گا۔ اس سے دوسرے لوگوں کو بھی ایسے ہی کام کرنے کا خیال آئے گا۔ اور اس طرح یہ اسکیم ملک کے دور دراز حصوں میں پھیل جائے گی۔ اس طرح ترقی صرف سرکاری منصوبوں اور سرمایہ پر ہی منحصر نہیں رہے گی۔ بلکہ مقامی آبادی بھی ترقی کے ان کاموں میں اپنی محنت۔ وقت۔ بچت اور صلاحیتیں صرف کرے گی۔ تب وہاں اسکول، اسپتال، سڑکیں کمیونٹی سینٹر، پینے کے پانی کی سہولتیں وغیرہ فراہم ہوں گی۔ اس محاذ پر حکومت کی طرف سے کیے گئے کچھ اہم کام مندرجہ ذیل ہیں۔

1. کمیونٹی ترقیاتی پروگرام (The Community Development Programme.)

یہ پروگرام 2. اکتوبر 1952. کو شروع کیا۔ یہ سرکاری مدد اور مقامی آبادی کے تعاون سے ترقی کے منصوبہ کا ایک تجربہ تھا۔ اس میں کامیابی کم ملی اور روپیہ کا بہت غلط استعمال ہوا۔

2. پیداوار بڑھانے والا ترقیاتی پروگرام (Intensive Development Programmes.)

یہ ایسے ضلعوں اور علاقوں میں شروع کیا گیا جہاں تیزی سے ترقی کرنے کے امکانات موجود تھے۔ یہاں ترقی کی کوششوں کو مرکزیت دی گئی۔ 1960 میں یہ پروگرام شروع کیا گیا۔ 1964 میں اس کو ضلعوں سے بھی وسیع علاقوں تک پھیلایا گیا۔ اور اس کا نیا نام پیداوار بڑھانے والا زرعی علاقائی پروگرام

(Intensive Agricultural Area Programme.) دیا گیا۔

3 ۔ سبز انقلاب

فی ایکڑ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی دریافت نے زراعتی ترقی کے پروگرام کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ ایسے بیجوں کو زیادہ پیداوار والے بیج (high yielding varieties) کہتے ہیں۔ بیجوں کے ساتھ ہی سینچائی کے لیے وقت پر پانی ملنے کی ضمانت، کیمیائی کھاد، کیڑے مار دوائیں، ٹریکٹر اور پمپ وغیرہ فراہم کیے گئے۔ زراعت کی دنیا میں یہ نیا طریقہ کار تھا۔ امید تھی کہ سبز انقلاب سے آمدنی بڑھے گی اور کاشت کاری میں زیادہ سرمایہ کاری ہوگی۔ اس سے کسانوں کا نظریہ بھی بدل جائے گا۔ اور یہ کسانوں کے لیے ایک جدید زندگی کی بنیاد فراہم کرے گا۔ دوسرے پروگراموں کے برخلاف ایسا لگتا ہے کہ سبز انقلاب کا کچھ فائدہ ہوا ہے۔ لیکن اس سے جزوی کامیابی ملی ہے۔ اس انقلاب سے زراعت کا کاروباری پہلو بہتر ہوا ہے۔ مگر دوسرے پہلوؤں پر خاص اثر نہیں پڑا۔ دیہی علاقوں میں سب سے کم اور سب سے زیادہ آمدنی والوں کے درمیان فاصلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اور اس طرح کچھ علاقوں میں نئے قسم کا سماجی تناؤ پیدا ہوگیا۔

4 ۔ خصوصی پروگرام (Special Programmes.)

یہ پروگرام کسانوں کے کمزور اور پسماندہ طبقے کی حالت کو سدھارنے کے لیے چوتھے منصوبے کے دوران شروع کیا گیا تھا۔ ایسی بہت سی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ جن کے تحت چھوٹے کسانوں کو معاشی یا دوسری طرح کی مدد دی گئی یا کسانوں اور دیہی بے روزگاروں کو ملازمتیں دی گئیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

Small Farmers[1] Development Agencies (SFDA),

Marginal Farmers[1] and Agricultural Labourers scheme,
MFAL

Drought Prone Areas Programme (DPAP)

Pilot Intensive Rural Employment Project (PIREP)

5. دیہی دستکاریاں (Rural Industries.)

مناسب جگہوں پر دیہی دست کاریاں شروع کرنے کے لیے کئی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ 1956 کے بعد سے بہت سے صنعت نگر قایم کیے جا چکے ہیں۔ جن علاقوں میں یہ نگر بنائے گئے ہیں وہ ترقی یافتہ علاقے ہیں جہاں پانی اور بجلی کی سہولیات مہیا تھیں اور شیڈ بنے ہوتے تھے۔ ان جگہوں پر چھوٹے پیمانے کی صنعتیں آسانی سے قایم کی جا سکتی تھیں۔

6. ترقیاتی مرکز (Growth Centres.)

ایک ترقیاتی مرکز اسے کہتے ہیں جہاں روزگار کے مواقع، بجلی، ذرائع آمد و رفت، رسل و رسائل، پانی کی سہولتیں وغیرہ مہیا کی جا سکتی ہیں۔ یا جہاں جہاں یہ سہولتیں جزوی طور پر پہلے سے موجود ہوں۔ ان مرکزوں میں پڑوس کے لوگ روزگار کی تلاش اور کارخانے لگانے کے لیے آئیں گے۔ اس سے لوگوں کا

---

(1) چھوٹے کسان وہ ہیں جن کے پاس 3 ہیکٹر تک زمین ہے اور حاشیائی کسان وہ ہیں جن کے پاس اس سے بھی کم زمین ہے۔

معیارِ زندگی اونچا ہوگا۔ اس طرز کے یہ مرکز اپنے آس پاس کے پورے علاقے کے لیے طاقت کا محور بن جائیں گے۔ اپریل 1970ء میں اس پروگرام کے لیے تحقیق شروع کی گئی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں ترقی کے یہ مرکز قایم کرنے کے لیے بیس مقامات منتخب کیے گئے۔ امید ہے کہ مستقبل میں دیہی ہندوستان کی ترقی کے لیے جو پروگرام بنایا جائے گا اس میں ان ترقیاتی مرکزوں کو خاص مقام حاصل ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ دیہی علاقوں کو جدید بنانے کے لیے بہت سے منصوبوں پر عمل ہورہا ہے بہت سی اسکیموں کا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ حقیقت میں ان میں سے ہر اسکیم ایک خاص مقصد کو پورا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر خشک سالی کے لیے منصوبہ DPAP صرف خشک زمینوں تک محدود ہے اور جہاں کہیں چھوٹے اور حاشیائی کسان ہیں وہ SFDA اور MFAL اسکیموں کے تحت آتے ہیں۔ مگر پھر بھی اتنی زیادہ اسکیمیں ہونے کے باوجود بہت کم کام ہوا ہے مثال کے طور پر SFDA کے تحت اب تک کاشت کے بہتر طریقوں کے تحت 20 فی صدی اور دوسرے پروگراموں کے تحت 12 فیصدی ہی کام ہو پایا ہے اور MFAL کے تحت کاشت کی بہتری کے لیے 25 فیصدی اور دوسرے پروگراموں کے لیے 13 فیصدی کام ہوا۔ سینچائی کی چھوٹی اسکیمیں، دیہی رسل ورسائل، مٹی کی حفاظت، جنگلات کا تحفظ اور پینے کے پانی کے لیے 111 کروڑ روپے Drought Prone Area Programme. کے تحت منظور کیے گئے۔ لیکن پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ (جلد II صفحہ 90) میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق ان پروگراموں پر جولائی 1973 میں صرف 74 کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ ان کوتاہیوں کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ کبھی ایک پروگرام پر زیادہ زور دیا گیا تو کبھی دوسرے پروگرام پر۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام بنایا گیا تو

فوراً ہی پیداوار بڑھانے والا ترقیاتی پروگرام شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد ترقیاتی مرکزوں کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ ان پروگراموں پر نگرانی بھی نہیں رکھی گئی۔ سرمایہ ضرور خرچ ہوا لیکن اصول اور منصوبے کے مطابق نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروگراموں کو پورا نہیں کیا جا سکا۔ ہو سکتا ہے انھیں اس حالت میں چھوڑ بھی دیا جائے۔

ان پروگراموں کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ جن لوگوں کے فائدے کے لیے پروگرام بنائے گئے انھوں نے خود اس میں زیادہ دل چسپی نہیں لی۔ مثال کے طور پر کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام اس لیے ناکام ہوا کیونکہ مقامی لوگوں نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور ان پروگراموں کو پورا کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل پیش نہیں کیے۔

انتشار آراضی (Fragmentation of holdings)

آزادی سے قبل کی زراعت کی حالت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جب زیادہ تر زراعتی زمین غیر حاضر زمینداروں کی ملکیت تھی جو خود کاشت نہیں کرتے تھے۔ دیہی خاندانوں کی اکثریت یا تو چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی مالک تھی یا پھر بے زمین کسان تھے۔ دستکاریوں کے زوال اور آبادی میں اضافے کی وجہ سے زمین پر آبادی کا مسلسل دباؤ بڑھا۔ اس وجہ سے چھوٹے کھیتوں کی تقسیم اور انتشار میں اضافہ ہوا۔ دیہی علاقوں کی زائد آبادی کو کہیں پر بھی روزگار نہیں ملا کیونکہ صنعتیں بھی زیادہ نہیں قائم کی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے کھیت، کسان خاندانوں کے سب ہی ممبروں کو کافی کام نہیں دے سکتے۔ دوسرے لفظوں میں دیہی علاقوں میں کافی وسیع چھپی ہوئی بے روزگاری ('disguised unemploy ment') ہے زیادہ تر لوگ بے زمین کسان تھے اور مستقل یا وقتی کرائے دار تھے جو دوسروں کی

(زمیندار، جاگیردار، انعام وغیرہ) پیدا کر دیا تھا۔ یہ درمیانی طبقہ اصل کاشت کاروں سے من مانا کرایہ وصول کرتا تھا۔ وہ حکومت کو ایک مقررہ لگان ہی ادا کرتا تھا۔ مقررہ لگان اور کرائے کی رقم میں جو فرق ہوتا تھا وہی زمیندار کی اصل آمدنی تھی۔ زمین پر آبادی کے بڑھتے دباؤ (آبادی کے اضافے اور روزگار کے دوسرے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے) کی وجہ سے زمیندار زیادہ سے زیادہ کرایہ مانگنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے کرائے داروں کو زمین سے بے دخل کر دیتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد ملک کے تمام صوبوں نے حکومت اور کاشت کار کے درمیان ہر قسم کے درمیانی طبقے کو ختم کرنے کے لیے قانون بنا دیے ہیں۔ کرائے دار زمیندار کو معاوضہ ادا کر کے زمین کے مالک بن سکتے تھے مگر زمینداروں نے زمینداری خاتمے کے قانون کو کسی حد تک ناکام بنا دیا۔ وہ خود کاشت کاری کرنے لگے۔ کرائے داروں کو زبردستی بے دخل کر دیا۔ کھیتوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا وغیرہ۔ زمینداری خاتمے کے ساتھ ساتھ کرائے کی حد مقرر کی گئی۔ مالک مقررہ کرایہ ہی کرایہ داروں سے وصول کر سکتے تھے۔ اور ان کی کرایہ داری کو مستقل کر دیا گیا۔ مگر کرائے داروں کی کمزوری کی وجہ سے زمینداروں کے لیے یہ قانون بے اثر رہے۔ زمیندار زیادہ کرائے وصول کرتے ہیں اور ان کو جب چاہیں زمین سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ اب کرائے داری کے معاہدے زبانی کیے جاتے ہیں اور پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔

زمینی اصلاحات کا ایک خاص پہلو زمین کی تقسیم میں نابرابری کو کم کرنا ہے۔ کسانوں کی اکثریت چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی مالک ہے جن پر انحصار کرنے والوں کو پورا روزگار بھی نہیں ملتا۔ مختلف ریاستوں کی سرکاروں نے کھیتوں کی حد مقرر کر دی ہے تاکہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو جوتا جا سکے۔ اس کا مطلب

زمین کا نقد یا جنس میں کرایہ ادا کرتے تھے۔ آبادی کے زمین پر بھاری دباؤ کی وجہ سے زمیندار اونچی در پر کرایہ وصول کرنے لگے۔ نتیجہ میں کرائے داروں کے پاس بہت تھوڑا اناج بچتا تھا۔ زمین کا اصل جوتنے والا چھوٹا کسان اور کرائے دار، انتہائی غریب تھا جس کے پاس زمین پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ زیادہ کرائے ادا کرنے کے علاوہ کرائے داری بھی غیر محفوظ تھی۔ اس کو زمین سے کبھی بھی بے دخل کیا جا سکتا تھا۔ کسانوں کو کاشتکاری کے طریقوں کے بارے میں کم واقفیت تھی۔ اس لیے زراعت کو جدید بنانے کے لیے مندرجہ ذیل مسائل کا حل ضروری ہے۔

1. لگان داری کی خامیوں کو دور کرنا۔ (a) درمیانی لوگوں (جیسے زمیندار جاگیر دار، انعام وغیرہ) کو ختم کرنا۔ (b) کرائے کے قوانین کو باضابطہ بنانا۔ (c) کرائے داروں کا تحفظ۔
2. کھیتوں کی تقسیم میں نابرابری کم کرنا، جیسے زمین کے وسیع رقبے چند لوگوں کی ملکیت میں ہیں اور دیہی خاندانوں کی اکثریت کا انحصار زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ہے۔
3. زراعت کی تکنیک کو بہتر بنانا اور کسانوں کو اس کے استعمال سے واقف کرانا۔
4. درج ذیل طریقوں سے کسان کو جدید تکنیک اپنانے میں مدد دینا۔
(a) سستے قرض (b) زیادہ زرخیز بیج، کھاد، کیڑے مار دوائیاں، آلات وغیرہ اور (c) چک بندی۔

زمینی اصلاحات

انگریزوں نے حکومت اور اصل کاشت کار کے بیچ میں ایک درمیانی طبقہ

ہے اس حد سے زائد زیادہ تمام زمین حکومت لے لے گی۔ اور پھر اس کو چھوٹے کھیت والے کسانوں یا بے زمین کسانوں کے درمیان تقسیم کردے گی۔ یہاں پر بڑے کسانوں نے اس مقصد کو ناکام بنایا۔ انھوں نے اپنی زمین کو تقسیم کردیا یا بیچ دیا، یا منتقل کر دیا۔ زمین کی حد بندی کے قوانین نافذ کرنے کے بعد پورے ملک میں بہت تھوڑی زمین کو فالتو بتایا گیا۔ اس میں سے بھی زیادہ تر زمین بنجر ہے۔

کاشت کے طریقے

عرصہ دراز سے کاشت کاری کے علم نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اور کسان روایتی و پرانے کاشت کے طریقے استعمال کر رہے تھے۔ اس لیے کاشتکاری کے علم کی ترقی اور کسانوں کو نئے طریقوں کے استعمال کی تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے کثیر رقم زراعتی تحقیق پر خرچ کی گئی ہے۔ ان تحقیقات کا تعلق، بہتر بیج پیدا کرنے، پودوں اور زمین کی حفاظت، فصلوں کے ہیر پھیر، کھاد کے استعمال میں کفایت، خشک کھیتی وغیرہ سے ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اصلاحات کے بارے میں مختلف ایجنسیوں کے ذریعے کسانوں کو باخبر کیا گیا۔ گنا۔ باجرہ اور گیہوں کی کاشت میں قابل تعریف نتائج سامنے آئے ہیں۔ دوسری فصلوں میں ترقی بہت کم ہوئی ہے۔

کسانوں کی داخلی ضروریات (input) کا پورا ہونا

کاشت کے بہتر طریقوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اچھے بیج، کیمیکل کھاد، کیڑے مار دوائیں، زرعی آلات خرید نے کے لیے کثیر رقم کی ضرورت ہے جو کہ عام طور سے چھوٹے کسانوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس لیے کسانوں

کو کھیتی کے نئے طریقے اپنانے کے لیے سستے قرضے اور جدید داخلیات (inputs) کو سستی قیمتوں پر مہیا کرکے حکومت کو مدد کرنی چاہیئے۔ کھاد اور کیڑے مار دواؤں کی ملک میں پیداوار میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ چیزیں باہر سے بھی درآمد کی گئی ہیں۔ کوآپریٹو اور دوسرے مالیاتی اداروں کے ذریعہ کسانوں کو قرض فراہم کرنے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ قومی بیج کارپوریشن (National Seed Corporation) کسانوں کو اچھے بیج فراہم کرتی ہے۔ مختلف تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ہم کسانوں کی بیج، کھاد، سینچائی اور قرض کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان چیزوں کی زیادہ تر سپلائی بڑے کسانوں کو چلی جاتی ہے۔ نتیجہ میں چھوٹے کسان "نئی زراعت" سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اب حالات آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں۔

زمینی اصلاحات نہ صرف زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے لیے بلکہ دیہی علاقوں میں نابرابری کو کم کرنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ ایک بار پھر یہ بتانا ضروری ہے کہ نئے اقتصادی پروگرام میں جو حکومت نے جولائی 1975, میں نافذ کیا تھا زمینی اصلاحات کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کو اوّلیت دی گئی ہے۔ اکثر ریاستوں نے پہلے ہی زمین کی حد بندی کے قوانین بنا دیے ہیں۔ اور وہ زمین کے ریکارڈ تیار کرنے کے لیے بھی اقدامات کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ نئے معاشی پروگرام میں پنج سالہ منصوبہ کی باقی مدت میں بڑے اور درمیانی سینچائی کے رقبوں کو 5 کروڑ ہیکٹر تک بڑھانے کا منصوبہ ہے۔ حکومت نے پچھلے چھ ماہ میں کھاد کی قیمتوں میں دو بار کمی کی ہے تاکہ وسیع پیمانہ پر کھاد کا استعمال ہوسکے۔ موجودہ سینچائی کی سہولیات کو پوری طرح استعمال میں لانے کے لیے بھی کوششیں جاری ہیں۔ نئے قسم کے بیجوں کی ضرورت کی طرف بھی بہت توجہ دی جارہی ہے۔ ان اقدامات سے زراعتی پیداوار میں مزید اضافہ ہونے کا کافی امکان ہے یہ امید ہے کہ زراعت کا

موسم پر انحصار بھی کم ہو جائے گا۔

دوسری خصوصی اسکیمیں

مندرجہ بالا اقدامات کے علاوہ حکومت نے کچھ خصوصی اسکیمیں بھی جاری کی ہیں
ان اسکیموں کا مقصد دیہی آبادی کو زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کرنا۔ چھوٹے کسانوں
کو کاشت کاری کے نئے طریقے اپنانے کا اہل بنانا اور ڈیری، مرغی پالن، سور،
اور مچھلی پالن جیسے ضمنی روزگار کے لیے سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ تیرھویں باب میں
اس بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

تیرھواں باب

بے روزگاری اور کم روزگاری

تعارف

پنج سالہ منصوبے شروع کرتے وقت ہمیں امید تھی کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے گی۔ خاص طور سے ہمیں امید تھی کہ ملک کے غریبوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ غربت کے مسئلے پر غور کرتے ہوتے ہم نے دیکھا کہ غربت کو ختم کرنے کی کوششوں کے باوجود غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح بے روزگاروں کی تعداد بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اس دوران بڑی تعداد میں نئے روزگار پیدا کیے گئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بے روزگار آدمی غریب ہی رہتا ہے۔ اگر اسے اپنے خاندان یا سماج سے کسی قسم کی معاشی مدد نہیں ملتی تو وہ غربت اور پریشانی میں رہے گا۔ اسی طرح بے روزگاری غربت کے مسئلے کو زیادہ سنگین بنا دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کچھ ایسے بھی غریب ہیں جو خود ہی کوئی کام کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا مقصد صرف ایسے لوگوں پر غور کرنا ہے جو تندرست بھی ہیں اور کام کرنے کے لیے تیار بھی لیکن انھیں کام نہیں ملتا۔

بے روزگاری کی قسمیں

بے روزگاری کئی طرح کی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی خاص قابلیت یا صلاحیت والے آدمی کو کوئی کام نہ ملے اور اُسے کافی عرصہ تک بے روزگار رہنا پڑے ایسا آدمی بے روزگاری کی واضح مثال ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اس کو ملازمت مل جائے۔ مگر ایسی ملازمت جس میں اس کی صلاحیتوں کا کوئی استعمال نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک ایم۔ اے شخص کو بس کنڈکٹر یا ڈاکیہ[(1)] بنا دیا جائے۔ بے روزگاری کی یہ دوسری قسم ہے۔ بے روزگاری کی تیسری قسم وہ ہے جس میں صرف کچھ دنوں کے لیے کام ملتا ہے۔ جیسے زرعی مزدوروں کو صرف فصل کے دوران ہی کام ملتا ہے۔ ایک دوسری مثال صنعتی مزدور کی ہے۔ جیسے دن کے آٹھ گھنٹوں میں سے فرض کیجیے صرف چار گھنٹے کام ملتا ہے۔ یہ سب مثالیں کم روزگاری (under-employment) کی ہیں۔ دیہی خاندانوں میں اس طرح کی کم روزگاری بہت زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے زمین اتنی کم ہوتی ہے کہ اُس سے خاندان کے سب افراد کو پورا کام نہیں ملتا۔ نتیجہ میں ان میں سے کافی لوگ فالتو ہوتے ہوتے بھی کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ جبکہ دراصل وہ بے روزگار ہوتے ہیں۔ اسے چھپی ہوئی بے روزگاری (*disguised* or *hidden* unemployment.) کہتے ہیں۔ جب بھی کم روزگاری کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو بہت سی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

---

(۱) اس طرح کے روزگار میں آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور کام کا معیار اور تعداد دونوں ہی کم درجے کے ہوتے ہیں۔ کم آمدنی والی نوکری سے کم سے کم جزوی طور پر بے روزگاری جیسے ہی اثرات پڑتے ہیں۔

بے روزگاری کے اسباب

کوئی بھی آدمی کام کرنے کی عمر سے ہی کیسے بے روزگار رہتا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ اس مسئلہ کا آغاز آبادی بڑھنے یا خاندانی افراد میں اضافہ ہونے سے ہوتا ہے۔ ایک بچہ جو آج پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کی جائے گی۔ اور خاندان کی حیثیت کے مطابق تعلیم یا تربیت دی جائے گی۔ 14 سال کی عمر کے بعد وہ کوئی کام کرنے یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب وہ بچہ کوئی کام یا نوکری تلاش کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ لیبر فورس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب اسے نوکری مل جاتی ہے تو وہ ایسے مزدوروں میں شامل ہو جاتا ہے جنھیں کام ملا ہوا ہے، جب اس کی نوکری چھوٹ جاتی ہے تو وہ پھر لیبر فورس میں شامل ہو جاتا ہے یعنی جہاں سے وہ چلا تھا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ وقت گذرتا ہے نئے لوگ لیبر فورس میں شامل ہوتے جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کو نوکریاں مل جاتی ہیں۔ اور یہ چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اور کسی بھی وقت روزگار اور بے روزگاری کی صورت حال کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہمارے پنجسالہ منصوبوں نے درج ذیل طریقے سے اس صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔

(آدمیوں کی تعداد ملین میں)

پنج سالہ منصوبے	آغاز میں بے روزگاری	5 سال میں لیبر فورس میں اضافہ	5 سال میں نوکریاں دی گئیں	منصوبے کے آخر میں بے روزگاری
پہلا منصوبہ	3·3	9·0	7·0	5·3
دوسرا منصوبہ	5·3	11·8	10·0	7·1
تیسرا منصوبہ	7·1	17·0	14·5	9·6
چوتھا منصوبہ	13·6	27·3	18·0	22·9

مندرجہ بالا اعداد و شمار کو آپ بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ پہلا منصوبہ 1951-52 میں شروع ہوا تھا۔ یہ اندازہ تھا کہ اس وقت بے روزگاروں کی تعداد 3·3 ملین تھی۔ پچھلے 14 سالوں میں 9·0 ملین افراد پیدا ہوئے جو 1951-52 سے 1955-56 تک لیبر فورس میں داخل ہوئے۔ اور اس دوران 7 ملین نئی نوکریاں مہیا کی گئیں۔ ان 7 ملین نوکریوں میں سے کچھ پر وہ لوگ لگ گئے جو کافی عرصے سے بے کار تھے۔ یعنی ان 3·3 ملین میں سے جو منصوبہ کے آغاز میں بے روزگار تھے اور کچھ ان 9·0 ملین میں سے جو بعد میں لیبر فورس میں داخل ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے منصوبے یعنی 1955-56. کے آخر میں 5·3 ملین لوگ بے روزگار تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے منصوبے کے آخر میں بے روزگاروں کی جو تعداد تھی وہ دوسرے منصوبے کے شروع کی تعداد بن گئی۔ اس منصوبے کے دوران بھی کچھ نئے بے روزگاروں کا اضافہ ہوا۔ بہت سے نئے روزگار فراہم کیے گئے۔ اور پھر کچھ باقی بچ گئے۔ تیسرے اور چوتھے پنجسالہ منصوبوں میں بھی یہی۔ صورت حال

رہی۔ جدول سے تمھیں ایک بات معلوم ہوگی، تیسرے منصوبے کے آخر میں بے روزگاروں کی تعداد 9.6 ملین تھی۔ لیکن چوتھے منصوبے کے شروع میں یہ تعداد 13.6 ملین ہوگئی۔ یہ 4 ملین کا فرق ہے۔ 4 ملین بے روزگاروں کا یہ اضافہ 'Plan Holiday' یعنی 1966-67, 1967-68 اور 1968-69. کے دوران ہوا۔

...

آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ بے روزگاری کے جو اندازے جدول میں دیے گیے ہیں قطعی درست نہیں ہیں۔ اس معاملے میں مشکل یہ ہے کہ بے روزگار کسے تسلیم کیا جائے؟ اس بارے میں سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے اگست 1961 میں ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ لیبر فورس کی نوعیت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ یعنی یہ بتایا جائے کہ ان میں کتنے دیہی علاقے سے آتے ہیں اور کتنے شہری۔ کتنے پڑھے لکھے اور کتنے ان پڑھ۔ کتنے ہنرمند کاریگر اور کتنے بے ہنر مزدور۔ کتنے مرد ہیں کتنی عورتیں ہیں وغیرہ۔ چنانچہ پنج سالہ منصوبہ سے بے روزگاری جاننے کا عام طریقہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک ادارہ ہے جو بے روزگاری کے اعداد و شمار جمع کرتا ہے۔ یہ ادارہ نیشنل سیمپل سروے (National Sample Survey.) کہلاتا ہے۔ اس ادارہ سے کہا گیا ہے کہ مندرجہ بالا طریقہ سے معلومات حاصل کرے۔ اس کام کے پورا ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ جب تک ہم آپ کو نیشنل سیمپل سروے کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر بے روزگار لوگوں کی تعداد کا ایک اندازہ دیتے ہیں

نیشنل سیمپل سروے ہفتہ واری معلومات حاصل کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی آدمی کو ہفتہ میں ایک دن بھی کام مل جاتا ہے تو وہ باروزگار سمجھا جاتا ہے۔ جس شخص کو ہفتہ میں ایک دن بھی کام نہیں ملتا اُسے بے روزگار سمجھا جاتا ہے جس شخص کو ہفتہ میں

42 گھنٹے سے کم کام کرنے کے لیے ملتا ہے اُسے کم روزگاروں کی فہرست میں درج کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے دیکھنے پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ 1971 میں لگ بھگ 9 ملین لوگ بے روزگار تھے۔ 20 ملین لوگ کم روزگار تھے۔ ان کم روزگاروں میں سے تقریباً 12 ملین لوگ ایسے تھے جنھیں ایک ہفتے میں 28 گھنٹے کا بھی کام نہیں ملتا تھا۔

روزگار بڑھانے کی تدابیر

اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ غریبی دور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ نوکری کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ غریب اور بے کار لوگوں کو مناسب تنخواہوں کی ملازمتیں دینی چاہئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جو لوگ اپنے پورے وقت اور پوری صلاحیتوں کو اپنے کام میں استعمال نہیں کر پاتے انھیں بہتر روزگار ملنا چاہیئے۔ اس مسئلے کو ہم دو طرح سے حل کر سکتے ہیں۔ اجرت والے روزگار یعنی ایسی نوکریاں فراہم کی جائیں جہاں تنخواہ یا اجرت کی شکل میں آمدنی ہوتی ہے۔ ذاتی اور نجی روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ یعنی ایسے روزگار جن میں لوگ خود اپنا ذاتی کام کرتے ہیں جیسے مستری، بجلی کے کاریگر، چھوٹے تاجر، مصور، بت تراش، جولاہے اور دستکار وغیرہ۔

اجرت والے روزگار کے مواقع، صنعت، ذرائع آمدورفت، بنک، بیمہ کمپنی، تجارت اور منظم زراعت میں بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ کلرکوں، ہنرمند اور کم ہنرمند کاریگروں، مزدوروں اور چپراسیوں کو بھی نوکریاں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سب کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے اور اس سرمایہ کو اس طرح لگایا جائے کہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کے لیے نوکریوں میں اضافہ ہو سکے۔

اگر ہم مشینیں خریدنے میں زیادہ سرمایہ لگائیں گے تو زیادہ نوکریاں مہیا نہیں کر سکیں گے۔ آدمی یا مشین کے درمیان انتخاب کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر مکان، کارخانے یا دفتروں کی عمارتیں بنانے میں کافی مزدوروں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ سفارش کی جا سکتی ہے کہ تعمیرات کے کاموں میں زیادہ سرمایہ لگا کر نوکریاں پیدا کی جائیں۔ لیکن کیا سیمنٹ اور فولاد کی مقدار میں اضافہ کے بغیر تعمیرات کے کاموں کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ تعمیراتی کام جب ہی ہو سکتے ہیں جب فولاد اور سیمنٹ دونوں کی مقدار کو بڑھایا جاتے۔ سیمنٹ اور فولاد کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے اور بھی وسیع پیمانہ پر صنعتی پیداوار کی ضرورت ہے۔ سیمنٹ اور فولاد کے کارخانے قایم کرنے کے لیے بھاری مشینوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان مشینوں میں سرمایہ لگانے سے فوراً ہی ملازمتیں پیدا نہیں ہو جائیں گی۔

ایک طرح سے ذاتی روزگار کو صنعت اور زراعت سے الگ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان میں اجرت والے روزگار فراہم ہو سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے اگر کسی جگہ پر ایک نیا کارخانہ قایم ہوتا ہے تو صرف اس کارخانے کے اندر ہی نوکریاں نہیں ملتیں بلکہ اُس کارخانے کے چاروں طرف بھی روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کارخانے کے آس پاس مرمت کی دکانیں، اسٹورس، ٹھیکے دار، حساب کتاب رکھنے والے اور اس طرح کے بہت سے لوگ جو اُس کارخانے کو مال اور مختلف قسم کی سہولتیں فراہم کریں گے۔ تاہم اور دوسرے بہت سے ذاتی روزگار کے موقعے زیادہ آزادانہ طور پر مہیا کیے جائیں۔ جیسے زراعت جس میں ہماری دو تہائی آبادی لگی ہوئی ہے۔ اس کے لیے اہم میدان ہو سکتا ہے۔ چھوٹے اور حاشیائی کسانوں کو کھیتی کی زیادہ نفع بخش اکائیاں قایم کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ کھیتی میں ذاتی روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یہ

ضروری ہے کہ زمین کی تقسیم اس طرح سے کی جائے کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے یا بہت کم زمین ہے انھیں زمین دی جائے تاکہ وہ اپنی ذاتی کھیتی کر سکیں اس کے علاوہ ان کی دوسرے طریقوں سے بھی مدد کی جاسکتی ہے۔ انھیں قرض دیا جانا چاہیئے۔ اچھے بیج اور کھاد بھی فراہم کیے جائیں اور ساتھ ہی انھیں پیداوار کو مناسب قیمت پر فروخت کرنے کی سہولت بھی دی جائے۔ ان طریقوں سے چھپی ہوئی بے روزگاری کم ہو جائے گی۔ اس طرح دیہی عوام کو شہر میں لاکر بسانے کے لیے مجبور نہیں ہونا پڑے گا۔ یہ ہم اس لیے بھی کرنا چاہتے ہیں کہ محدود زمین پر وسیع خاندانوں کا بوجھ کم ہو جائے۔

اب تک ہم نے جو کچھ بھی بتایا ہے اس کا نتیجہ فوراً ہی سامنے آئے گا۔ ہمیں آبادی کو بڑھنے نہیں دینا چاہیئے۔ اس کے بعد بے روزگاری کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے۔ مستقبل میں آبادی کی وسعت میں کمی ہونے سے لیبر فورس میں بھی کمی آئے گی۔ اس کے نتیجے میں بے روزگاری کی صورت حال صحیح معنوں میں بہتر ہوگی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ حال ہی میں 20 نکاتی معاشی پروگرام کے تحت کیے گئے اقدامات سے ہر سمت میں اچھے نتائج نکلے ہیں۔

خلاصہ

بے روزگاری کے صحیح اندازے نہیں ہیں۔ — بہت سی تحقیقات کے مطابق اس وقت ہماری لیبر فورس کا 10% بے روزگار ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں بے روزگاری کی وجوہات ہیں۔ اشیائی سرمایہ (مشینیں، عمارتیں، فیکٹریاں، آلات وغیرہ) اور مزدوروں کو کام کرنے کے لیے ضروری امدادی وسائل کی کمی۔ اشیائی سرمایہ کا اسٹاک اور دوسرے امدادی وسائل کو صرف

سرمایہ کی تشکیل اور بچتوں سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ چوتھے باب میں بتایا جا چکا ہے۔ اس مسئلہ کا کوئی اور دوسرا حل نہیں ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا۔

شہری علاقوں میں بے روزگاری کی وجوہات (a) صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری اور (b) تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری ہیں۔ دو قسم کی بے روزگاری سے دیہی علاقوں کو پریشانی ہے۔ اول زراعت میں موسمی نوعیت کا کام ہوتا ہے جس کی وجہ سے صرف چند ماہ کے لیے ہی کام ملتا ہے اور باقی دنوں میں بہت تھوڑا کام ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شکر سازی کی صنعت میں صرف جاڑوں کے مہینے میں کام ہوتا ہے اور سات مہینے تک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کو موسمی بے روزگاری کہتے ہیں۔ دوسرے زیادہ تر دیہی خاندانوں کے پاس چھوٹے چھوٹے کھیت ہوتے ہیں۔ یہ کھیت اتنے چھوٹے ہیں کہ خاندان کے تمام افراد کا فی کام نہیں دے سکتے۔ پھر بھی خاندان کے تمام افراد کھیت پر کام کرنے میں شریک رہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ سب بے روزگار ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ نہ تو پورے مہینے اور نہ ہی دن کے پورے گھنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ اس قسم کی بے روزگاری کو چھپی ہوئی بے روزگاری کہتے ہیں۔ کھیت میں جتنا کام ہے اس کو چند افراد کر سکتے ہیں۔ اور اگر کام مل جاتے تو باقی لوگ کہیں اور کام کر سکتے ہیں۔

دیہی علاقوں میں بے روزگاری اور کم روزگاری کو کم کرنے کے لیے حکومت نے بہت سی اسکیمیں بنائی ہیں جیسے

The Rural Works Programme,

Crash Programme for Rural Employment اور

Integrated Dry Land Agricultural Development Scheme

ان سب کا مقصد چھوٹے پیمانے کی سینچائی، زمین کی حفاظت، سیلاب سے حفاظت، نالیاں بنانا، نئی زمین زیر کاشت لانا، دیہی سڑکوں کی تعمیر، پینے کے پانی وغیرہ سے متعلق منصوبوں کے ذریعہ دیہی علاقے میں روزگار پیدا کرنا ہے۔
ان اسکیموں کے علاوہ چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی

(Small Farmers Development Agency)

اور حاشیائی کسانوں اور زرعی مزدوروں کی ایجنسی

(Marginal Farmers and Agricultural Labourers Agency)

چھوٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کو قرضے فراہم کرتی ہیں۔ تاکہ وہ ڈیری، مرغی پالن، سور پالن، مچھلی پالن، باغبانی وغیرہ جیسے مددگار کام کر سکیں اور اپنے خاندان والوں کے لیے ذاتی روزگار فراہم کر سکیں۔ قرض بھی مہیا کیے جاتے ہیں تاکہ وہ بیج، کھاد، کیڑے مار دوائیں وغیرہ خرید سکیں۔
پیداواری کاشت کو اپنا سکیں۔ زیادہ پیداواری کاشت کم روزگاری کو آہستہ آہستہ کم کرتی ہے۔ ایگرو سروس سینٹر اسکیم (Agro Service Centre Scheme) کے تحت تکنیکی لوگوں، (مکنیکل انجنیر، ایگریکلچر گریجویٹ، الیکٹریکل انجنیر) کو قرض فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ ورکشاپ یا ایجنسیاں قایم کر سکیں جن سے زراعت کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح کی اسکیمیں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے واسطے شہروں میں قایم کی گئی ہیں۔
اوپر بیان کیے گئے اقدامات کے باوجود بے روزگاری کا مسئلہ اب بھی حل طلب ہے۔ دیہی علاقوں میں روزگار کی ترقی، بڑھتی ہوئی لیبر فورس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ جون 1975 میں گو حکومت نے دیہی علاقوں میں پیداواری

روزگار کو بڑھانے کے مواقع کا جائزہ لینے کے لیے ایک اسٹڈی ٹیم مقرر کی تھی۔
صنعتی سیکٹر میں بھی صورت حال زیادہ بہتر نہیں ہوئی ہے۔ گذشتہ ایک سال
میں اگرچہ معیشت کے منظم سیکٹر میں ،2% روزگار بڑھے ہیں۔ لیکن یہ بھی پبلک
سیکٹر کی وجہ سے روزگار کے دفتروں کے رکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ روزگار تلاش
کرنے والوں کی تعداد 7% بڑھ گئی ہے۔ 1975-76 کے معاشی جائزے کے
مطابق اب یہ امید ہے کہ جولائی 1975 سے صنعتی پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے روزگار کی حالت
بہتر ہوئی ہے نئے اقتصادی پروگرام کی بدولت روزگار کے مواقع بڑھ گئے ہیں
خاص طور سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے کیونکہ نوآموز لوگوں کے لیے موجودہ تمام
خالی جگہوں کو فوری طور پر پُر کیا جا رہا ہے۔

چودھواں باب

بڑھتی قیمتوں کا مسئلہ

تعارف

ہم آٹھویں باب میں یہ بتا چکے ہیں کہ ایک آزاد بازاری معیشت میں زر کا کیا رول ہے۔ ہم نے اضافی قیمتوں اور عام قیمتوں کے فرق کو بھی بتایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ عام قیمتوں میں تبدیلی کی وجہ سے مختلف طبقوں اور پیداوار پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہم نے پچھلے پندرہ سالوں میں عام قیمتوں کی بڑھتی ہوئی سطح کی نوعیت اور اس کے اسباب کے بارے میں بحث کی ہے۔

قیمت میں اضافہ کی نوعیت

ہندوستان میں ماضی قریب میں قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ پہلے منصوبہ کے پانچ سال کے دوران یعنی 1951-52 سے 1955-56. تک قیمتیں 17 فیصدی کم ہوئیں۔ اس کے بعد قیمتیں بڑھنے لگیں۔ اگلے دو منصوبوں کے دوران قیمتیں 6-7 فیصدی سالانہ کی شرح سے بڑھتی رہیں۔ 1966-67 اور 1968-69 کے دوران یہ 9 فیصدی تک بڑھ گئیں۔ یہ اوسط اضافہ ہے۔ تاہم اگر 1968-69. میں قیمتیں ایک فیصدی تک نہ گرتیں تو حالت اور بھی

خراب ہو جاتی۔ اس تھوڑی سی مدت کو چھوڑ کر جس میں قیمتوں میں کمی آئی باقی مدت میں قیمتیں بڑھتی ہی رہیں۔ قیمتوں میں اضافے کے اعتبار سے سب سے خراب زمانہ 1972-73 سے شروع ہوتا ہے۔ جب قیمتوں میں 10 فیصدی اضافہ ہوا۔ جو 1973-74 میں بڑھ کر 22.6 فیصدی تک پہنچ گیا۔ اور 1974-75 کے پہلے مہینوں میں (اپریل۔ ستمبر 1974) قیمتیں یہیں ٹھہر گئیں۔ حقیقت میں 1974 کی آخری چوتھائی (اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر) میں قیمتوں میں 3.5 فیصدی کمی ہوئی۔ لیکن یہ معمولی سی کمی پچھلے ڈیڑھ سال کی بہت زیادہ مہنگائی کے بعد آئی۔

1951-52 اور 1973-74. کی قیمتوں میں جو فرق آیا ہے مندرجہ بالا اعداد و شمار سے آپ اسے اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ کے ابتدائی سالوں کے دوران جہاں قیمتوں میں کچھ کمی آئی ہے۔ وہاں میں وہ بڑی تیزی سے بڑھنے لگیں۔ قیمتوں کی اس تبدیلی کو عددی اشاریہ یا انڈکس نمبر Index Number سے ناپا گیا ہے۔ جسے تھوک قیمتوں کا عددی اشاریہ یا انڈکس نمبر کہتے ہیں۔ اس میں کچھ چیزوں (1000 چیزیں) کی قیمتیں فیصدی کے حساب سے نکالی جاتی ہیں۔ 1961-62 کی قیمتوں کو برابر 100 کے مانا گیا ہے اور پھر اس سے اوسط نکالا گیا ہے۔ اس بنیاد پر 1973-74 میں انڈکس نمبر 254 ہو گیا۔ اور ستمبر 1974 میں بڑھ کر تک پہنچ گیا۔ 25 سالوں میں یہ نمبر سب سے زیادہ تھا۔ اس سے روپے کی قوت خرید میں کمی کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک روپیہ میں جتنی چیز آتی تھی دسمبر 1974 میں 100/314 یا صرف اس کا ایک تہائی ہی خریدا جا سکتا تھا۔ اس سے صرف اوسط حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اناج جو غریب آدمی زیادہ خریدتے ہیں کی قیمتیں حقیقت میں بہت بڑھ گئیں۔ اس لیے ان کی قوت خرید کافی کم ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس

انڈکس میں حکومت کی جانب سے متعین قیمتوں کو ذہن میں رکھا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت میں بازار میں اُس قیمت پر چیزیں نہیں ملتیں۔ اگر بازار کی اصل قیمتوں کو دھیان میں رکھا جاتا تو اضافہ کہیں زیادہ ہوتا۔ اور اُس حساب سے قوت خرید بھی گھٹ جاتی۔

قیمتیں کیوں بڑھتی ہیں؟

جب کسی معیشت میں چیزوں اور سہولتوں کی مجموعی طلب رسد سے بڑھ جاتی ہے تو قیمتیں عام سطح سے اونچی ہو جاتی ہیں رسد کے مقابلہ میں طلب میں جو زیادتی ہو گی اس کا ایک ہی نتیجہ ہوگا اور وہ یہ کہ قیمتوں کی عام سطح اونچی ہو جائے گی (یا افراطِ زر شروع ہو جائے گا) خواہ یہ زیادتی رسد کے مقابلے میں مجموعی طلب میں اضافے یا رسد کو کسی متبادل استعمال میں منتقل کرنے یا رسد میں کمی کی وجہ سے ایک بازاری معیشت میں، کسی بھی قسم کی سرمایہ کاری ہو اس سے فوراً ہی معیشت میں زر آمدنی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے چاہے صارفین کی طلب کی چیزوں اور سہولتوں کی پیداوار میں اضافہ ہو یا نہ ہو، اگر معیشت میں زائد پیداواری استعداد ہے تو زر کی طلب میں اضافہ سے پیداکار زیادہ پیداوار کرنے لگیں گے۔ لیکن اگر ایک دفعہ تمام پیداواری استعداد پورے طور سے استعمال کر لی جائے تو کل پیداوار اس نقطہ سے آگے نہیں بڑھائی جا سکتی جب تک کہ نئی پیداواری استعداد کو نہ بڑھا لیا جائے۔ اگر پیداواری استعداد میں اضافے کے بغیر زر کی طلب اس نقطہ سے آگے بڑھ جاتی ہے تو مجموعی طلب مجموعی رسد سے بڑھ جاتے گی اور پیداوار میں اضافہ ہوئے بغیر عام قیمتوں کی سطح اونچی ہو جاتے گی۔

تم پڑھ چکے ہو کہ گذشتہ 15 سالوں سے آبادی 2.5% کی سالانہ شرح

سے بڑھ رہی ہے۔ اس دوران معاشی ترقی پر بھاری سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے اخراجات بھی بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ان اخراجات کی وجہ سے لوگوں کی فی کس آمدنی بھی بڑھ رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور بڑھتی ہوئی فی کس آمدنی کی وجہ سے معیشت میں چیزوں اور سہولتوں کے لیے زر کی طلب بھی بڑھ رہی ہے۔

طلب کے معاملے میں ایک دوسرا عنصر بھی کارفرما ہے۔ جب سرمایہ کاری کا خرچ ٹیکسوں سے حاصل شدہ سرمایہ سے پورا ہوتا ہے تو لوگ اپنی موجودہ طلب کے صرف میں کمی اور کچھ حصہ اپنی بچتوں سے کم کر کے ٹیکس کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس صورت میں جب نئی سرمایہ کاری نئی آمدنی پیدا کرے گی اور نتیجہ میں نئی طلب وجود میں آئے گی تو ٹیکسوں کی وجہ سے کسی حد تک طلب میں کمی آئے گی۔ اس کے برخلاف اگر سرمایہ کاری پر خرچ نیا زر پیدا کر کے کیا گیا ہے تو نئی آمدنی اور اس کے نتیجے میں نئی طلب سے مجموعی طلب میں اصل اضافہ ہوگا۔ اس لیے خسارے کی سرمایہ کاری (deficit financing) سے معیشت میں مجموعی طلب ٹیکسوں کی آمدنی سے کی گئی سرمایہ کاری کے مقابلہ میں بڑھ جائے گی۔ ہندوستان میں خسارے کی سرمایہ کاری ہر پنجسالہ منصوبہ میں مسلسل بڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف صارفین کی چیزوں اور سہولتوں کی رسد بڑھتی ہوئی مجموعی طلب کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(1) زیادہ تر رقم کی سرمایہ کاری ایسے منصوبوں (بنیادی اور بھاری صنعتوں وغیرہ) میں کی گئی ہے جو ایک خاص وقت کے بعد ہی پیداوار کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ صنعتیں اپنی پیداوار شروع کریں (یا دوسری صنعتوں کو پیداوار میں مدد دیں) چیزوں کی طلب رسد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور قیمتیں بڑھ

جاتی ہیں۔

(2) بعض کام جو معیشت میں زرآمدنی پیدا کرتے ہیں اس کا نتیجہ کبھی بھی صارفین کی طلب کے مطابق چیزیں اور سہولتیں پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ مثلاً جنگ اور دفاع پر اخراجات معیشت میں زرآمدنی بڑھا دیتے ہیں۔ مگر کل پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہندوستان کو جنگوں (ایک چین اور دو پاکستان سے جنگیں) پر زرکثیر خرچ کرنا پڑا ہے۔ اس وجہ سے سالانہ دفاعی اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔

(3) ہندوستان کو اپنی گھریلو رسد کا ایک حصہ بنگلہ دیش سے آئے لاتعداد رفیوجیوں کے لیے بھیجنا پڑا۔

(4) ہماری زراعت کا زیادہ تر انحصار قدرت کے رحم و کرم پر ہے۔ بارش کے وقت پر نہ ہونے سے کتنی مرتبہ زرعی پیداوار کم ہو جاتی ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں (باب 7) کہ زراعتی پیداوار کی کمی کس طرح پوری معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گذشتہ 15 سالوں میں جب بھی زراعتی پیداوار کم ہوئی ہے تب ہی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ جب مجموعی قیمت بڑھتی ہے تو سٹے باز اور ذخیرہ اندوز زیادہ سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ اور قیمتوں کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔

قیمتوں کو روکنے کی تدابیر

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنا بہت ضروری ہے مگر یہ کام بہت مشکل ہے اس سمت میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ پیداوار بڑھائی جائے۔ خاص طور سے اناج کی پیداوار پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔

اور اس کے لیے جو بھی اقدامات ضروری ہوں وہ کیے جائیں جیسے چھوٹے کسانوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔ زمین جوتنے والوں کو زمین دینا۔ ٹیوب ویل۔ سستے بیج۔ کھاد۔ پمپوں کے لیے بجلی اور پیداواری ضروری اشیا کو خریدنے کے لیے قرض کا انتظام ہونا چاہیئے۔ زندگی کی دوسری ضروری صنعتی اشیا کی پیداوار بھی بڑھائی جائے۔ جیسے سستا کپڑا۔ چینی، وناسپتی، ماچس وغیرہ۔ دوسری طرف رسد پر نگرانی رکھی جائے اس سے لوگوں کی زر آمدنی (money income) گھٹ جائے گی۔ اس کا ایک بہت بڑا ذریعہ بذات خود حکومت ہے۔ جب حکومت اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتی ہے تو اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے کاغذی کرنسی چھاپتی ہے۔ یہ کرنسی حکومت زیادہ تنخواہوں کی شکل میں سرکاری ملازمین اور سرکار کو مختلف قسم کا مال سپلائی کرنے والوں کو دیتی ہے۔ اگر حکومت اپنا خرچ کم کردے یا کارخانوں اور ٹیکسوں سے آمدنی بڑھائے اور زیادہ کاغذی کرنسی نہ چھاپے تو زر آمدنی کے اضافے کو روکا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنکوں کو احکام دیے جا سکتے ہیں کہ وہ تاجروں اور جمع خوروں کو غیر پیداواری کاموں کے لیے قرضے نہ دیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ بنکوں سے قرض نہ ملنے پر بھی ان لوگوں کو کالے بازار سے روپیہ مل جائے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کالے دھن کو روکا جائے۔ اور اس پر نگرانی رکھی جائے۔

ایک بہت اہم قدم یہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو اپنے بڑھتے ہوئے زر آمدنی میں سے زیادہ بچت کرنے کے لیے کہا جائے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ پہلے ہی بہت تنگی سے رہتے ہیں۔ پھر بھی متوسط طبقے کے لوگوں کو بچت کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس طرح کے کچھ تجربات لازمی بچت اسکیم کے تحت کیے ہیں۔ امید ہے ان کے اچھے نتیجے نکلیں گے۔ ایسے آثار دکھائی

دیتے ہیں کہ مستقبل میں قیمتوں میں اتنی تیزی سے اضافہ نہیں ہوگا. لیکن بہت کچھ رسد پر منحصر ہے۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوتے ضروری ہے کہ حکومت عوام کے لیے تقسیم کا ایسا انتظام قایم کرے کم سے کم جس کے ذریعہ انکم ٹیکس نہ دینے والے لوگوں کو اور بے زمین کسانوں کو سستے داموں پر اناج مل سکے۔

ستمبر 1974، میں قیمتیں اپنی انتہا کو پہنچنے کے بعد گرنی شروع ہوگئیں۔ 1974-75 کے آخر (یعنی مارچ 1975) میں تھوک قیمتیں 7.5 فیصد کم ہوئیں۔ 1975-76، کے دوران پہلے تین مہینوں میں اضافے کے بعد تھوک قیمتیں کم ہوئی ہیں اگرچہ 1975-76 میں ایندھن، خوراک اور کھاد جیسی اہم چیزوں کی درآمدی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اور رسد زر اور خسارے کی سرمایہ کاری وغیرہ میں اضافہ ہوا. لیکن اس کے باوجود 5.5 فیصدی قیمتیں کم ہوئی ہیں۔

گذشتہ چند سالوں میں انتہائی افراطِ زر کا جو سامنا ہوا، اس پر اب معلوم ہوتا ہے قابو پا لیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ قیمتیں 1974، سے مسلسل کم ہو رہی ہیں۔ ایسا حکومت کی افراطِ زر کے خلاف کارروائیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ جون 1975، میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد حکومت نے مندرجہ ذیل مزید اقدامات کیے ہیں۔

1. جمع خوروں، کالا دھندہ کرنے والوں، اسمگلروں اور ٹیکس چوروں کے خلاف سخت اقدامات کیے گئے۔
2. 1975، کے Voluntary Disclosure of Income and Wealth Ordinance، کے تحت اندازاً 1,600 کروڑ روپے کی چھپی ہوئی آمدنی اور دولت (کالا دھن) حکومت کو حاصل ہوئی۔
3. ٹیکس ادا نہ کرنے اور ٹیکس سے بچنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی

کی گئی۔ نتیجہ میں ٹیکس سے حاصل شدہ حکومت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔

4. ڈبہ بند چیزوں پر قیمت، وزن، بنانے کی تاریخ، بنانے والے کا نام وغیرہ لکھنا اور تمام چیزوں کی قیمتوں کی فہرست لگانا ضروری کر دیا۔

5. عوام کے صرف کی ضروری اشیا جیسے اناج، چینی، مٹی کا تیل وغیرہ کی تقسیم کا انتظام کیا۔

6. صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا کیونکہ (a) صنعتی خام مال (جیسے کپاس اور تیل نکالنے کے بیج) اشیائے خوردنی اور کھانے کی تیل کی رسد میں اضافہ ہوا۔ (b) ہڑتالوں اور تالہ بندیوں سے ہونے والے نقصانات میں بھاری کمی ہوئی۔

7. قیمتوں کو کم کرنے میں جس چیز نے سب سے بڑا رول ادا کیا ہے وہ ہے 1975 کی خریف اور اپریل 1976 کی ربیع کی اچھی فصلیں۔

بڑھتی قیمتوں کو بلاشبہ روکا گیا ہے۔ بہرحال ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ قیمتوں میں بڑی حد تک کمی کی وجہ مذکورہ بالا اقدامات کے علاوہ 1975-76 کے امید افزا موسمی حالات بھی تھے۔ جس کی وجہ سے سب سے زیادہ زرعی پیداوار ہوئی۔ ایک زرعی معیشت میں ناموافق موسمی حالات کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں اتار چڑھاؤ، قیمتوں کے استحکام کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے قیمتوں میں استحکام کے لیے (a) زراعتی پیداوار کے اتار چڑھاؤ کو سینچائی کے اچھے انتظامات، کیڑے مار دواؤں اور اچھے بیجوں وغیرہ کے استعمال سے کم کیا جا سکتا ہے۔ (b) زراعتی پیداوار کو نئے زراعتی طریقوں (اچھے بیجوں، کھاد اور کیڑے مار دوائیں وغیرہ) کو استعمال میں لا کر قابل کاشت

رقبے میں نئی قسم کے بیج اگا کر بڑھایا جا سکتا ہے (۳) اناج کی حصولی کے انتظامات کو مضبوط بنایا جائے (۴) عوام کے صرف کی ضروری اشیا کی سرکاری تقسیم کا انتظام باقی رکھا جائے (۵) ذخیرہ خوروں، سٹے بازوں اور کالا دھندہ کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے (۶) چیزوں کو رکھنے کے لیے گوداموں اور ان کی فروخت کے انتظامات کیے جائیں۔

پندرھواں باب

ہمارا معاشی مستقبل

تعارف

تم پڑھ چکے ہو کہ آزادی کے وقت ہندوستانی معیشت کی حالت کتنی خراب تھی۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ انگریزوں نے ہماری معیشت کو انحصاری معیشت بنادیا تھا۔ ہماری دولت کا ایک بڑا حصہ باہر بھیجدیا گیا تھا۔ ہم غریب بنادیے گئے اور ہماری معیشت پسماندہ رہ گئی۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ بے پناہ قدرتی اور انسانی وسائل ہونے کے باوجود ہماری یہ حالت ہوئی جب ہم آزاد ہوئے تو قدرتی طور سے ہماری یہ خواہش ہوئی کہ ہمارا معاشی معیار بلند ہو اور ہم اپنی قدیم تاریخی شان کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس لیے ہم نے منصوبہ بند معاشی ترقی کا راستہ اپنایا۔ بہت سے پنج سالہ منصوبے تیار کیے گئے۔ ان سب کا مقصد غربت دور کرنا اور نابرابری کو ختم کرنا تھا۔ ان منصوبوں کو ایک سماج وادی نظام کے تحت عمل میں لایا گیا۔ کیونکہ سماج واد کو ہم نے اپنا مقصد بنایا تھا۔
جیساکہ تم پڑھ چکے ہو کہ ہمیں بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئیں پچیس سال کے اس سفر میں ہمیں بہت سے مسئلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہمیں منصوبہ بندی کو بھی ملتوی کرنا پڑا۔ تیزی سے بڑھتی

ہوتی آبادی، قیمتوں میں مسلسل اضافہ، زراعتی پیداوار میں جمود، خوراک اور آبادی کا بگڑا ہوا توازن، غیر معمولی بےروزگاری اور کم روزگاری اور بھیانک غربت جیسے مشکل مسئلوں سے ہم دوچار تھے۔ قدرتی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مستقبل کیا ہے؟ خاص طور سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہمارے لیے غربت دور کرنا، روزگار فراہم کرنا اور ہر اس شخص کے لیے جو اس آزاد جمہوریہ ہند میں پیدا ہوا ہے کم سے کم ضروریات زندگی کی چیزیں فراہم کرنا ممکن ہے؟ اس باب میں ہم اپنے مقاصد کے اور دستور میں دیے گئے ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں کے پس منظر میں اپنے مستقبل کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے۔

ریاستی پالیسی کے رہنما اصول

ہندوستان کے دستور میں عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ریاست کے کچھ بنیادی مقاصد کی نشان دہی کی گئی ہے۔ انھیں رہنما اصول کہتے ہیں۔ ان کے پیچھے مقصد یہ تھا، ایک ایسا سماجی نظام قایم کرنا جس میں سب کو سماجی معاشی اور سیاسی انصاف ملے اور جو قومی زندگی کے سب اداروں پر اثر انداز ہو۔ خاص طور سے ریاست کو درج ذیل مقاصد کے حصول کے لیے ہدایت کی گئی ہے۔

1۔ ہر عورت و مرد شہری کو روزی کمانے کے کافی ذرائع کا حق حاصل ہو۔
2۔ قوم کے مادّی وسائل کی ملکیت اور اختیار کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ عوام کی بھلائی ہو۔
3۔ معاشی نظام ایسا نہ ہو کہ سرمایہ اور پیداوار کے ذرائع چند ہاتھوں میں محدود ہو جائیں اور ان سے عوام کی فلاح و بہبود میں رکاوٹ پیدا ہو۔

ایک مفید اور مناسب رہنما اصول یہ تھا کہ ریاست اپنی معاشیات کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ جہاں تک ممکن ہو یہ کوشش کرے کہ ہر شہری کو تعلیم اور کام اس کی قابلیت کے مطابق ملے اور حکومت بے کاری اور بیماری و بڑھاپے کی حالت میں سب کو امداد کی ضمانت دے۔

جمہوری سوشلزم

بعد میں سوشلسٹ طرز کا معاشرہ ('socialist pattern of society.) قایم کرنے کے مقصد میں دستوری فرمان بھی شامل کر دیے گئے۔ سوشلسٹ طرز کا معاشرہ کیا ہو ؟ 1955 میں کانگریس کے اوادی اجلاس میں اس فقرہ کی صحیح وضاحت کی گئی۔ 1954 میں پارلیمنٹ نے پہلے ہی اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کانگریس کے بھونیشور اجلاس میں اس کو نیا نام دیا گیا یعنی جمہوری سوشلزم تب سے ہم اس مقصد کو منصوبہ بندی کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مطابق سماجی و معاشی نظام کی خاص بنیادی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(a) ترقی کی سمت کو اس طرح متعین کیا جائے گا جس سے ذاتی منافع کے بجائے سماجی بھلائی ہو۔

(b) ترقی کا ڈھانچہ اور سماجی و معاشی تعلقات کو اس طرح منصوبہ بند کیا جائے کہ قومی آمدنی ، روزگار ، آمدنی اور دولت کی مساوی تقسیم میں اضافہ ہو۔

(c) پیداوار ، تقسیم ، صرف اور سرمایہ کاری کے متعلق اہم فیصلے ایسے ادارے کریں جن کا مقصد سماجی بھلائی ہو۔

معاشی ترقی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ پسماندہ طبقوں کو حاصل ہو۔ ایک معمولی آدمی جسے ابھی تک ترقی کے عظیم امکانات میں حصہ لینے کے بہت کم مواقع حاصل تھے۔ اب اُسے جہاں تک ممکن ہوسکے۔ اپنے معیار زندگی کو بہتر کرنے اور ملک کی خوشحالی میں زیادہ سے زیادہ اپنا حصہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس طرح اس کا معاشی و سماجی معیار اونچا ہوگا۔ اب اُسے غریب خاندان میں جنم لینے یا شروع سے ہی غربت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں اُٹھانا پڑے گا۔

● مذکورہ بالا ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے سماج جس کا مقصد جمہوری سوشلزم قایم کرنا ہے ــــ کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوں گی۔

(i) نچلی سطح پر آمدنی کے مواقع فراہم کرکے بنیادی ضروریات زندگی جیسے خوراک، کپڑا، مکان، تعلیم وصحت کا انتظام کرنا۔

(ii) زیادہ آمدنی کو کم کرکے اور کم سے کم آمدنی کو بڑھاکر معاشی نابرابری کو کم کرنا۔

(iii) بڑے تاجروں پر قانونی اور دوسری پابندیاں لگاکر ذاتی اجارہ داریوں اور بڑے کاروباروں کے اضافے کو اس طرح روکنا کہ معاشی ترقی کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور معاشی قوت کو یکجا ہونے سے روکا جاسکے۔

(iv) قیمت، ذاتی نفع، اور آمدنی پر کنٹرول کیا جائے۔ پرائیویٹ سیکٹر کے پھیلاؤ کو کم کیا جائے۔ پبلک سیکٹر کو بڑھایا جائے اور سماج وادی تقسیم کا نظام قایم کیا جائے۔ اس طرح پیداوار کو ذاتی نفع خوری کے بجائے

سماجی بھلائی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(v) ذات، مرتبہ اور درجہ کے فرق کے بغیر سب لوگوں کو روزگار، مفت اور سستی تعلیم اور سماجی تحفظ کے مواقع فراہم کر کے انفرادی شخصیت کی نشو ونما کا انتظام کرنا چاہیئے۔

(vi) جمہوری قدروں پر زور دینا چاہیئے۔ اور قوت و اقتدار کی تقسیم کر کے اور صنعتوں کو پورے ملک میں پھیلا کر پُرامن طریقوں سے سماجی و معاشی مقاصد کی تکمیل کی جائے۔ مذہبی معاملوں میں مداخلت نہ کرنے اور قانون کا احترام کرنے کی پالیسی بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔

اب ہم اپنے جمہوری سوشلزم کے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے معاشی مستقبل کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

عدم مساوات اور علاقائی عدم توازن کا خاتمہ

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ آمدنی اور دولت کے فرق کو ختم کیا جائے۔ پچھلے ابواب میں اس مسئلے کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ غریبوں اور پسماندہ طبقوں کو ترقی کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ مگر اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ نابرابری کو کم سے کم کر کے ملک کا مستقبل اور سماج کا مقصد روشن ہوسکتا ہے۔

یہ مسئلہ علاقائی عدم توازن کی شکل میں بھی موجود ہے۔ ہماری کچھ ریاستیں معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں اور کچھ کم ترقی یافتہ ہیں۔ ایک ہی ریاست کے اندر کچھ علاقے ترقی یافتہ ہیں اور کچھ علاقے کم ترقی یافتہ ہیں۔ اگر ہم فی کس آمدنی کا غور سے مطالعہ کریں اور غریبی کے خط سے نیچے کی آبادی، زراعت پر

انحصار کرنے والی آبادی، صنعتوں میں لگی ہوئی آبادی سے متعلق معلومات کا مطالعہ کریں تو ہمیں ملک کے مختلف علاقوں کے درمیان موجود فرق کا علم ہو جائے گا بہار، مشرقی اترپردیش، اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور تامل ناڈو کے دیہی علاقے اور مغربی بنگال بہت غریب اور پسماندہ ہیں۔ پنجاب، ہریانہ، مہاراشٹر، گجرات، مغربی یوپی کسی قدر خوشحال ہیں۔ عدم توازن کی وجوہات قدرتی و انسانی عوامل دونوں ہیں۔ اگر ان علاقوں کی ترقی پر کافی توجہ نہیں دی گئی تو یہ ہماری منصوبہ بندی کی ناکامی ہوگی۔

ہمارے پنجسالہ منصوبوں میں اس عدم توازن کو کم کرنے کے لیے بڑا زور دیا گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے چوتھے منصوبے میں مندرجہ ذیل تجویزیں پیش کی گئیں۔

مرکزی معاشی امداد پسماندہ علاقوں میں مرکز کے جاری کردہ منصوبوں کا آغاز۔ مقامی منصوبے تیار کرنا۔ پسماندہ علاقوں کو رعایتی شرح پر مالی امداد دینا وغیرہ۔

اس عدم توازن سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنائی گئی سب ہی تدبیروں میں ایک خاص کمی یہ رہی ہے کہ ہم نے سرمایہ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مرکزی امداد کو ان علاقوں کی ترقی کے دوسرے پروگراموں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ منصوبے اس طرح بنائے جائیں کہ پسماندہ علاقوں کی اچھی طرح نشان دہی ہو جائے۔ اس کے بعد ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان علاقوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کے لیے مرکزی، ریاستی اور ضلعی سطح پر مشترکہ ترقی کے منصوبے اور ساتھ ہی مقامی لوگوں کی دلچسپی اور مدد بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ یقیناً اس

مشترکہ منصوبہ بندی سے ترقی کی رفتار کو تیز کیا جا سکے گا۔ اور ممکن ہے پانچویں اور چھٹے پنجسالہ منصوبے کے آخر تک علاقائی عدم توازن کے مسئلے سے چھٹکارا مل جائے۔

معیار زندگی کو اونچا اٹھانا

ہماری معاشی ترقی کا ایک اہم مقصد ہمارے عوام کے معیار زندگی کو اونچا اُٹھانا ہے۔ اس وقت ہمارا معیار زندگی دنیا کے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس کی خاص وجوہات، آبادی میں تیزی سے اضافہ، کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار میں کم اضافہ اور قومی آمدنی کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ مندرجہ ذیل جدول کے اعداد و شمار میں 1960-61 اور 1973-74 میں کچھ اہم اشیائے صرف کی فی کس دستیابی دکھائی گئی۔

اشیائے صرف		1960-61	1973-74
اناج	(گرام میں)	468·7	448·4
کھانے کے تیل	(کلوگرام میں)	3·2	3·0
ونسپتی	(کلوگرام میں)	0·8	0·8
چینی	(کلوگرام میں)	4·17	6·0
سوتی کپڑ	(میٹر میں)	13·8	12·1
مصنوعی دھاگے	(میٹر میں)	1·2	1·5
چائے	(گرام میں)	287·0	413·0
کافی	(گرام میں)	80·0	67·0
بجلی	(کلوواٹ میں)	3·4	* 7·5

* 1972-73 کے لیے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اناج، کھانے کے تیل اور سوتی کپڑا جیسے انتہائی بنیادی ضروریات زندگی کا اوسط فی کس صرف چودہ سال (۱۹۷۴-۱۹۶۰) میں کم ہوا ہے۔ چائے، چینی اور بجلی کا صرف ضرور کچھ بڑھا ہے۔ لیکن اس کی مقدار اب بھی کم ہے۔

غربت کا مسئلہ بیان کرتے وقت ہم اس سوال پر پہلے غور کر چکے ہیں۔ اس وقت آپ نے غور کیا ہوگا۔ کہ ہندوستان میں نہ صرف اوسط کیلوریز (خوراک کی مقدار) کا صرف کم ہے۔ بلکہ حفاظتی غذا (دالیں، پھل، سبزیاں جن سے پروٹین وٹامن اور معدنیات ملتی ہیں) کا صرف بھی ہندوستان میں کافی کم ہے۔ کپڑے کے صرف کا بھی یہی حال ہے۔ اگرچہ ہماری کپڑے کی صنعت کافی ترقی یافتہ ہے اور ہم دنیا کے کپڑا بنانے والے اہم ملکوں میں سے ہیں۔ پھر بھی ہم اپنی آبادی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں۔ کنٹرول نرخ کے کپڑے (جو عوام کے استعمال کے لیے ہیں) کی پیداوار مسلسل کم ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں کچھ سخت اقدامات اور تقسیم کا موثر نظام قایم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ جو کچھ تیار ہو اسے بلیک مارکیٹ میں جانے سے روکا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ حال ہی میں حکومت کا یہ فیصلہ کہ پیداکاروں کو کپڑے کے ہر میٹر پر قیمت لکھنی چاہیئے اس سے یہ برائی ختم ہو جائے گی۔

مکان، طبی امداد، ہسپتال اور تعلیم کی سہولیات، رفاہ عام (پینے کا پانی، نالیاں، سڑکیں، پارک وغیرہ) کا انتظام بہت ناکافی ہے۔ صنعتی شہروں میں بڑھتی آبادی، گندی بستیوں اور سڑکوں پر رہنے والی آبادی میں اضافہ اور اسپتالوں میں بیماروں کی بھیڑ سے آبادی کے غیر معمولی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ایک عام ہندوستانی کی پیداواری استعداد

کم ہوگی کیونکہ اسے اچھی غذا اور زندگی کی ضروری سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں بھی حکومت کئی اقدامات کر چکی ہے جس سے سماج کے کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

صَرف کے معیار کو اونچا کرنے کی حقیقی بنیاد دراصل تمام صحت مند لوگوں کو جو کام کرنا چاہتے ہیں معقول تنخواہوں کے ساتھ روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ اگرچہ حال میں کافی لوگوں کو روزگار ملا ہے لیکن اجرت کی سطح پست ہونے کی وجہ سے معیار زندگی اونچا نہیں اٹھ سکا ہے۔

بے روزگاری کو ختم کرنے، فوری امداد اور دوسری کم مدتی تدابیر اختیار کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ماضی میں اس کام پر کافی روپیہ خرچ بھی کیا گیا ہے۔ جس کے اچھے نتائج نکل رہے ہیں۔

خود کفالت

تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں خود کفالت کے مقصد کو بتدریج پورا کرنے کا مقصد رکھا گیا تھا۔ منصوبہ بندی کے مقاصد والے باب میں ہم نے اس پر بحث کی ہے۔ اب تک آپ پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ خود کفالت کی تدابیر ضروری ہیں۔ خود کفالت، انحصاریت کے برعکس ہے۔ جب ہم نے اپنا ترقیاتی پروگرام شروع کیا تھا اُس وقت ہماری انحصاری معیشت تھی۔ یہ سب کچھ برطانیہ کی کھلی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کی وجہ سے ہوا۔ اب ہمارا مقصد مکمل طور پر خود کفیل بننے کا ہے تاکہ ہم اپنی منصوبہ بندی کو بامعنی بنا سکیں۔ ہندوستان کے معاملہ میں خود کفالت کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی امداد ختم کی جائے۔ اور خاص طور سے اس امداد کو بالکل بند کر دیا جائے جو ہمیں رعایتی شرطوں پر ملتی ہے۔ ایسا کرنے کے امکانات کا

انحصار اناج، کھاد، کچا تیل، اخباری کاغذ، کپاس، تیل نکالنے والے بیج وغیرہ جیسی ملکی پیداوار کی مقدار میں اضافے پر ہے۔ اگر ان چیزوں کی پیداوار میں کمی آتی ہے تو ہمیں مجبور ہو کر درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہماری برآمدی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہو سکتا تو غیر ملکی مدد سے چھٹکارا پانا مشکل ہوگا۔ ہمارے خود کفیل بننے کے مقصد کی کامیابی کا راز اس پر بھی منحصر ہے کہ غیر ملکی قرضوں کے دباؤ کا ہم کیسے مقابلہ کرتے ہیں۔ سود اور قرضوں کی ادائیگی کا دباؤ ہمیں غیر ملکی قرضے کے چکر میں پھنسائے رکھ سکتا ہے۔ اس چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہمیں اصل امداد کو کم کرنا پڑے گا اصل امداد کا مطلب ہے۔ خام امداد gross aid میں سے سود اور ادائیگی کی رقموں کو کم کرنا۔ پانچویں پنجسالہ منصوبے میں 1978-79. تک اصل امداد net aid کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خود کفالت کے پروگرام کے لیے سب سے زیادہ مفید قدم کافی تعداد میں اعلیٰ معیاری چیزوں کی برآمد میں اضافہ ہے۔ اگر ہم اپنی درآمد کی ادائیگی کے لیے غیر ملکی سرمایہ کما سکیں تو ہمارے غیر ملکی کھاتوں میں سرمایہ باقی رہے گا۔ اور اصل امداد کی رقم دھیرے دھیرے ختم ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اتنا ہی قرض لیں گے جتنا کہ ہمارے موجودہ قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہماری برآمد اور زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ہمارے پاس پہلے قرضوں کو خود ادا کرنے کے لیے سرمایہ بچ جائے گا۔ تب یہ ہی اصل خود کفالت کہلائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ مستقبل قریب میں ہماری خود کفالت خاص طور سے اہم سیکٹروں میں پیداوار میں اضافے اور برآمد کے پھیلاؤ پر منحصر ہے۔

اختتام

ہندوستانی معیشت پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں وسیع امکانات موجود ہیں۔ قدرت ہمارے اوپر مہربان رہی ہے لیکن ہم اپنے تمام وسائل کا پتہ لگانے اور ان کا استعمال کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ خوشحالی بڑھانے کے لیے قومی منصوبوں کے اچھے نتائج اُس حالت میں نکل سکتے ہیں جب انھیں عوام کی تائید اور حمایت حاصل ہو۔ ملک میں ہر شخص اور ہر خاندان یعنی ہر بچت اور خرچ کرنے والی اکائی کو قومی منصوبے کے مقاصد کے مطابق ہی اپنا منصوبہ تیار کرنا ہوگا۔ اور رفاہ عام کے بڑے مقصد کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق قربانی دینی ہوگی۔ انسانی وسائل اور قوتوں کا جو معیار ہم بنا پائیں گے اسی پر آخر میں انفرادی اور اجتماعی خوش حالی اور خود کفالت کی جد و جہد کا انحصار ہے۔ منتظمین مہم جو، بچت کرنے والوں سرمایہ کاروں کی پرجوش اور لگن والی ٹیم اور ایک مضبوط اور متحرک انتظامی ڈھانچہ ہی ہماری کوششوں کو معنی و مفہوم دے سکتے ہیں۔ اور آخر کار ہمارے پنجسالہ منصوبوں کی کامیابی بھی انھیں پر منحصر ہے۔ حقیقت میں ہمارا معاشی مستقبل شاندار ہے لیکن اسے حاصل کرنے کی امید ہماری کوششوں پر منحصر ہے۔ اور اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کتنی لگن اور ایمانداری سے اپنی قوتوں اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں۔

ترقی اُردو بورڈ

کی

درسی کتابیں

مڈل اسکولوں کے لیے

۱۔جیومٹری	حصہ اول	مترجم	محمد جمیل	قیمت	دو روپے
۲۔جیومیٹری	حصہ دوم	”	تسنیم احمد	”	”
۳۔جیومیٹری	حصہ سوم	”	اسدالرحمان	”	”
۴۔حساب والجبرا	حصہ اول	”	یاور حسین	”	”
۵۔حساب والجبرا	حصہ دوم	”	محمد یوسف	”	
۶۔حساب والجبرا	حصہ سوم	”	تحسین حسین رضوی	”	
۷۔گھریلو سائنس	حصہ ششم	”	سلیم احمد	”	”
۸۔گھریلو سائنس	حصہ ہفتم	”	ایس۔اے۔رحمان	”	”
۹۔گھریلو سائنس	حصہ ہشتم	”	تاجور سامری	”	”
۱۰۔طبیعات	حصہ دوم	”	ڈی۔اے۔انصاری	”	”

بچوں کے لیے دلچسپ کتابیں

1	فٹ بال کی کہانی	راج نرائن راز	6 روپے
2	پھول مالا	سعادت نظیر	2.50 روپے
3	حاتم طائی کا قصہ	مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن نقوی	6.50 روپے
4	بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	2 روپے
5	اچھی چڑیا	شفیع الدین نیر	3 روپے
6	چار درویشوں کا قصہ	مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن نقوی	3.25 روپے
7	ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	1.85 روپے
8	للی پٹ کا سفر	مرتبہ م ندیم	2.25 روپے
9	اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	2.50 روپے
10	چڑیاں	سلطانہ آصف فیضی	3 روپے
11	چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	1.50 روپیہ
12	پیسے کی کہانی	غلام حیدر	3 روپے
13	خط کی کہانی	"	3.75 روپے
14	سرسید احمد خاں	میر نجابت علی	1 روپیہ
15	راجہ رام موہن رائے	سچیندر لال گھوش	3.50 روپے
16	شریف زادہ	مرتبہ: حفیظ عباسی	2.25 روپے
17	عقلمند مچھیرا	م ندیم	2.20 روپے
18	دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	2.25 روپے

ملنے کا پتہ

بیورو فار پروموشن آف اردو

ویسٹ بلاک 8 راما کرشنا پورم، نئی دہلی 110022